تاریخ اور سیاست

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر

تاریخ کی باتیں
پاکستانی معاشرہ
تاریخ کے نئے زاویے
تاریخ کی آگہی
گمشدہ تاریخ
تاریخ اور آج کی دنیا
تاریخ تحقیق کے نئے رجحانات
سندھ کی تاریخ کیا ہے؟
تاریخ کی آواز
تاریخ کی تلاش
اشرافیہ اور روایات
سندھ کی سماجی و ثقافتی تاریخ
تاریخ اور تحقیق
[illegible]
جدید تاریخ
یورپ کا عروج
برطانوی راج (ایک تجزیہ)
در در ٹھوکر کھائے (آپ بیتی)
بدلتی ہوئی تاریخ
جاگیرداری
مغل دربار
تاریخ اور سیاست
[illegible]
تاریخ اور معاشرہ

تاریخ اور سیاست
ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز
فکشن ہاؤس

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مستند کتابیں

تاریخ اور دانشور
سندھ خاموشی کی آواز
آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان
برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ
علماء اور سیاست
تاریخ اور عورت
تاریخ اور فلسفہ تاریخ
تاریخ کی روشنی
المیہ تاریخ
اچھوت لوگوں کا ادب
تاریخ کے بدلتے نظریات
غلامی اور نسل پرستی
تاریخ کیا کہتی ہے
اکبر کا ہندوستان
جہانگیر کا ہندوستان
تاریخ اور مذہبی تحریکیں
لطف اللہ کی آپ بیتی
شاہی محل
تاریخ شناسی
تاریخ قتل اور ڈاکو
تاریخ کھانا کھانے کے آداب
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تاریخ اور سیاست

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز
بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : تاریخ اور سیاست
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : تاریخ پبلی کیشنز لاہور
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2012ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:
فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور فون: 042-37249218-37237430
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس
● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

تاثرات 5

حصہ اول

1- تاریخ کیوں ضروری ہے؟ 7
2- تاریخ کیسے بنتی ہے؟ 10
3- تاریخ کیسے پڑھنا چاہیے؟ 13
4- تاریخ اور آج کی دنیا 17
5- تاریخ اور نصابی کتب 21
6- تاریخ اور شکست 26
7- تاریخ اور احساسِ جرم 29
8- تاریخ اور تحریکیں 32
9- تاریخی شعور 34
10- تاریخ اور سائنسی و فنی ایجادات 38
11- تاریخ کی تقسیم 42
12- تاریخ اور اقلیت 45
13- تاریخ کی وسعت 48
14- تاریخ میں قوموں کا تصادم 51
15- تاریخ اور بغاوت 55
16- یورپی اقوام اور تاریخ کا نقطہ نظر 58
17- آخری عہد مغلیہ اور آج کی صورت حال 62
18- انسانی عظمت کی اہمیت 66
19- قومی ثقافت کیسے بنتی ہے؟ 69

حصہ دوم

1-	امپیریل ازم کیا ہے؟	72
2-	امپیریل ازم کی تعریف	80
3-	امریکی امپیریل ازم کی بنیادیں	84
4-	نو آبادیاتی نظام اور اس کی ابتداء	88
5-	ابتدائی نو آبادیاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ	91
6-	امپیریل ازم کا عہد	98
7-	مقامی لوگوں کی جدوجہد	109
8-	نیا امپیریل ازم	118
9-	آزادی اور نیو کولونیل ازم	132

حصہ سوم

1-	انقلاب کیا ہے؟	138
2-	انقلاب کا بدلتا مفہوم	145
3-	انقلاب کے نظریات	148
4-	فرانسیسی انقلاب	157
5-	روسی انقلاب	177
6-	چینی انقلاب	189
7-	تیسری دنیا اور تبدیلی	197

تاثرات

تاریخ کیوں ضروری ہے؟ تاکہ لوگ ماضی میں ہونے والے واقعات' اور تاریخی عمل سے واقف ہو کر ذہنی و شعوری طور پر پختگی حاصل کر سکیں۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ پچھلی قومیں جو غلطیاں کر چکی ہیں' ان سے بچا جا سکے۔

تاریخ کا مطالعہ قوموں کو ایک احساس دلاتا ہے' ان میں ایک وجدان پیدا کرتا ہے کہ ماضی کے تجربات سے وہ حال کی رفتار کو سمجھ سکیں۔

اس کتاب کے پہلے حصہ میں تاریخ کے بارے میں مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ امپیریل ازم کے بارے میں ہے کہ جس میں کچھ مضامین کا انگریزی سے ترجمہ ہے' تیسرا حصہ انقلاب کے بارے میں ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں بہت سے دانشور اب انقلاب کی راہ سے ہٹ چکے ہیں۔ مگر یہ سوال ابھی بھی اہم ہے کہ ان معاشروں میں کہ جہاں پر خرابیاں اپنی انتہا پر پہنچ جائیں' کیا وہاں اصلاحات ممکن نہیں؟ اس لئے یہ حصہ خاص طور سے ہمارے لئے اہم ہے۔ فرانس' روس' اور چین کے معاشروں میں انقلاب سے پہلے جو حالات تھے۔ ہم آج انہی سے دوچار ہیں۔ اس لئے یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان کا حل کیا ہونا چاہئے؟ یہ حل ڈھونڈنے کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔

مبارک علی

مئی 1993ء لاہور

تاریخ کیوں ضروری ہے؟

معاشرہ میں علم کی کسی شاخ کو اسی وقت مقبولیت ملتی ہے جب وہ اس کی ضروریات کو پورا کرے اور اپنی افادیت کو معاشرے کے لئے ضروری بنا دے' چونکہ معاشرے کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں' اس کے تقاضے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اس کے مسائل نئے نئے انداز اختیار کرتے جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ علم کو بھی اسی کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہئے تاکہ وہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو سمجھ سکے اور نئے پیدا شدہ مسائل کے حل دریافت کر سکے۔ اس لئے جب ہم تاریخی شعور کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب تبدیلی کا شعور ہوتا ہے اور یہی تبدیلی کا شعور تاریخ کے مضمون کو اہم بناتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں اب تک تاریخ کا مطالعہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اس کے ذریعہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیا جائے بلکہ اس کا مقصد محض تفریح کے طور پر ماضی کے حالات کو جاننا ہے۔ اسی لئے تاریخ کو ہمارے معاشرے میں افادیت کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور زندگی کی عملی ضرورتوں میں' اور معاشرہ کی تشکیل میں اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ ہمارے معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل ہے' اور اگر ایسا ہے تو پھر اس سے یہ کام اب تک کیوں نہیں لیا گیا؟

تاریخ کی ایک تو وہ حیثیت ہے کہ جو ہمارے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کو خاص سیاسی مقاصد کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔ اس محدود نقطہ نظر کی وجہ سے تاریخ معاشرہ کے لئے مفید علم بن کر نہیں ابھرتی۔ تاریخ کا دوسرا استعمال اخلاقی وعظ کا ہے کہ جس کے تحت تاریخ کو ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح سے معاشرہ کے اخلاقی مسائل کو حل کر دیا جائے گا۔ تاریخ کے اس تنگ سیاسی اور مذہبی استعمال نے تاریخ کی اہمیت کو بھی گھٹا دیا ہے۔

تاریخ کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ سب سے اہم مقصد تو یہ ہے کہ معاشرہ تاریخ کے ذریعہ بحیثیت مجموعی اپنی شناخت کرائے' اور یہ شناخت اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔ مثلاً ہمارا معاشرہ جہاں ایک طرف

طبقات میں بٹا ہوا ہے وہاں وہ ذاتوں' فرقوں' اور قبائل میں بھی تقسیم ہے۔ گاؤں اور شہری زندگی میں فرق ہے' زبان' عادات و اطوار' اور جغرافیائی فرق ہے۔ ان حالات میں علم کی کمی کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے پوری طرح سے واقف نہیں ہوتے اور یہ ناواقفیت انہیں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے دور لے جاتی ہے بلکہ ان کے بارے میں غلط رویے قائم کرنے اور تعصبات کو پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں خانہ بدوش قبائل کے بارے میں معلومات انتہائی محدود ہیں' اکثر ہم انہیں شہروں سے باہر جنگلوں اور ویرانوں میں آوارہ گردی کرتے دیکھتے ہیں' اور جو بھی ان کے بارے میں سن لیتے ہیں اس پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ان کی طرز رہائش' عادات و اطوار سے ہماری کم علمی ان کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی کچھ مذہبی فرقوں اور ذاتوں کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے دوری بڑھتی رہتی ہے۔

یہاں پر تاریخ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان خانہ بدوش قبائل کی تاریخ کو لکھا جائے' ان کی رسومات و عقائد کی تحقیق کی جائے اور ان کی صحیح تصویر معاشرے کے سامنے پیش کی جائے تو اس صورت میں نہ صرف بدگمانیاں دور ہوں گی بلکہ ان کے قریب آنے میں بھی مدد ملے گی۔ یہی عمل مذہبی فرقوں' اور مختلف ثقافتی ذاتوں اور برادریوں کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ تاریخ ان سب کو ملا کر معاشرہ کی شناخت کی تشکیل کرے گی اور نفرت و تعصبات کو مٹا کر ایک دوسرے کو قریب لائے گی۔

تاریخ کے ذریعہ جہاں ایک طرف معاشرے کے بٹے ہوئے' بکھرے ہوئے اور تقسیم شدہ لوگوں کو ملانے کا کام لیا جا سکتا ہے وہاں اس کے ذریعہ دوسری قوموں اور معاشروں میں ہم آہنگی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ انسانی معاشرہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے معیار پر دوسروں کے اخلاق' مذہب اور طرز معاشرت کو دیکھتا ہے اور جب اسے ان میں تضاد نظر آتا ہے تو وہ اس کی تاریخی اہمیت کو سمجھے بغیر اسے غلط قرار دے دیتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو ہندو مذہب کے تہوار اور ان کی رسومات خرافات نظر آتی ہیں لیکن اگر قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور اس پس منظر میں ان کی رسومات' تہوار اور روایت کو دیکھا جائے کہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئے' اور انہوں نے تاریخی لحاظ سے معاشرے کی کن ضروریات کو پورا کیا تو صرف اس صورت میں ہم ان کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے اور صرف اسی صورت میں ہمارے تعصبات دور ہو سکیں گے۔ اس لحاظ سے تاریخ نہ صرف تعصبات و نفرت کو دور کر سکتی ہے بلکہ ذہن کو وسیع کر کے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتی ہے۔ تاریخ کا کام یہ نہیں

کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون سا مذہب سچا اور اعلیٰ ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ تاریخی عمل میں ہر مذہب اور نظریہ کی پیدائش کا جائزہ لے کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرے تاکہ اس کے تاریخی کردار کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک زمانہ تھا کہ انسان کے لئے یہ دنیا بہت چھوٹی تھی' وہ جس شہر' گاؤں اور دیہات میں رہتا تھا وہیں پوری زندگی گزار دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کے تجربات بڑے محدود ہوتے تھے اور اس کی معلومات افواہوں پر ہوا کرتی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں آج کی دنیا بہت پھیل گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذہن بھی پھیلا ہے۔ اب یہ تاریخ کا کام ہے کہ وہ دنیا کی قوموں' ملکوں' اور معاشروں کے بارے میں پوری پوری اور صحیح صحیح معلومات فراہم کرے تاکہ یہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ کیونکہ تاریخ انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہے' اس کے مذہب' نسل' اور رنگ سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔

تاریخ کی سب سے بڑی افادیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ معاشرے کی یادداشتوں کو مجموعی طور پر محفوظ کرتی ہے۔ ایک فرد کی یادداشت کمزور ہوتی ہے' اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ بھی ایک واقعہ کو جلد بھول جاتا ہے' اگر ان واقعات کو تاریخ کے ذریعہ محفوظ نہیں کیا جائے تو معاشرہ ان کے تجربات کو چاہے وہ اچھے ہوں یا برے جلد ہی بھلا دیتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان معاشروں میں جہاں جدید تاریخ تشکیل نہیں دی گئی' اور جہاں عوام کو جاہل رکھا گیا ہے وہاں سیاسی طور پر وہی اشخاص بار بار اقتدار میں آتے ہیں کہ جو ماضی میں جرائم کے مرتکب ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہی سیاسی جماعتیں جو ایک بار اقتدار میں آ کر عوام پر ظلم و ستم کر چکی ہوتی ہیں وہ دوبارہ پھر عوام دوستی کے نعرے لگا کر اقتدار حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ ان کے کردار اور اعمال کو محفوظ نہیں رکھتی' اور عوام اپنا دکھ بھرا ماضی جلدی بھلا کر فریب میں آجاتے ہیں۔ صرف تاریخ کے ذریعہ اس عمل کو روکا جا سکتا ہے اور صرف اسی کے ذریعہ راہنماؤں اور جماعتوں کا احتساب ہو سکتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ کے مطالعہ سے معاشرہ کو خود آگہی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ دوسرے معاشروں کے مقابلہ میں وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ تاریخ ہی سے اسے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کن وجوہات کی بنا پر ترقی کرتے ہیں اور کون سی وجوہات ترقی کی راہوں کو روکتی ہیں۔ ماضی کا تجربہ اس کے لئے ایک آئینے کی مانند ہوتا ہے کہ جس میں وہ اپنی رفتار اور عمل کو دیکھ سکتا ہے۔ خود آگہی کا یہ احساس معاشرے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔

تاریخ کیسے بنتی ہے؟

ایک زمانہ تک یہ سمجھا جاتا رہا تھا کہ شخصیتیں تاریخ کی تعمیر و تشکیل کرتی ہیں اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں ان کے افکار و تعلیمات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اسی خیال نے تاریخ میں "ہیرو ورشپ" کا نظریہ پیدا کیا اور تاریخ لکھتے وقت شخصیتوں کو مرکز بنا کر واقعات کو بیان کیا گیا۔ لیکن جب فلسفہ تاریخ پر کام ہوا تو اس کے نتیجہ میں تاریخ کا مطالعہ وسیع نقطہ نظر سے کیا جانے لگا اور تاریخ کی تہہ میں جا کر واقعات کا جائزہ لے کر تاریخ کے عمل کو سمجھا جانے لگا۔ اس وجہ سے تاریخ کے مطالعہ میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ اور خصوصیت سے اس بات پر توجہ دی گئی کہ ان عناصر کی نشان دہی کی جائے کہ جو تاریخ بناتے ہیں، تاریخ میں بنیادی تبدیلیاں لاتے ہیں، اور تاریخ کے عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ کیا شخصیتیں تاریخ کو بناتی ہیں یا حالات شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں؟ اس بحث کے نتیجہ میں جو دلائل اور شواہد سامنے آئے وہ یہ ہیں کہ شخصیتیں خلا میں پیدا نہیں ہوتیں اور نہ ہی نظریات و افکار اچانک خلاؤں میں آتے ہیں بلکہ یہ حالات کے دباؤ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ شخصیتوں کا وجود مخصوص حالات کی وجہ سے ہوتا ہے اور ماحول کے زیر اثر ان کے افکار اور تعلیمات تشکیل ہوتی ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ شخصیتوں کو پیدا کرتا ہے اور بعد میں یہ زمانہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مثلاً عیسائیت کی تعلیمات کو دیکھئے کہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ شہنشاہیت اپنے عروج پر تھی اور اس کی قوت و طاقت کے خلاف کوئی بھی مزاحمتی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسپارٹاکس کی راہنمائی میں غلاموں نے جو بغاوت کی تھی اسے سختی اور تشدد کے ساتھ ختم کر دیا گیا تھا۔ اس صورت حال میں مظلوم اور پسے لوگ صرف اس صورت میں اپنی بقا کو قائم رکھ سکتے تھے جب کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے۔ اس لئے عیسائیت میں کہا گیا کہ "خدا کا حصہ خدا کے لئے اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کے لئے" اور اس میں ظلم کو برداشت کرنے کی تلقین کی گئی اور اسی وجہ سے رومی شہنشاہیت نے عیسائیت کی تعلیمات کو اپنے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھا اور انہیں سختی سے کچل کر ختم نہیں کیا۔

اسی پس منظر میں ہندوستان میں گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں برطانیہ ایک بڑی قوت و طاقت تھی کہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ 1857ء کے ہنگاموں میں جب کہ برطانوی حکومت کے خلاف تحریک چلی تو اسے انتہائی بے دردی سے ختم کر دیا گیا، قتل و غارت گری، اور لوٹ کھسوٹ کے عمل نے لوگوں میں خوف اور دہشت کو پیدا کر دیا۔ اس لئے اہل ہندوستان ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ نو آبادیاتی حکومت کے خلاف کوئی مزاحمتی تحریک شروع کی جائے۔ ان حالات میں عدم تشدد کی ہی پالیسی ایسی تھی جو لوگوں کے لئے قابل قبول تھی۔ چونکہ یہ حالات اور وقت کی ضرورت تھی اس لئے یہ مقبول ہوئی اور ہندوستان کے بالائی طبقوں نے بھی اس پالیسی کی اس لئے حمایت کی کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کے معاشرتی و سیاسی اور معاشی ڈھانچہ میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آرہی تھی، اور ان کے مفادات کو اس میں پورا پورا تحفظ مل رہا تھا۔

اس کے مقابلہ میں روس میں انقلاب 1917ء کے وقت حالات دوسرے تھے۔ وہاں انقلاب کے بعد لینن کو معاشرہ کا ڈھانچہ بنیادی طور پر بدلنا تھا اور یہ کام وہ عدم تشدد کے ذریعہ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ قدیم نظام کے حامی پوری قوت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے تھے اس لئے تشدد کے ذریعہ مخالفت کو ختم کر کے معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں لائی گئیں۔ اس لئے شخصیتیں تاریخ میں وہی کرتی ہیں کہ جس کا تقاضہ حالات کرتے ہیں۔ وہ اس تاریخی عمل کا ایک حصہ ہوتی ہیں، بذات خود عمل نہیں ہوتیں۔ اس لئے جب تاریخی عمل آگے کی جانب بڑھتا ہے، حالات بدلتے ہیں، اور ماحول تبدیل ہوتا ہے تو ان کے افکار، خیالات، اور نظریات پیچھے رہ جاتے ہیں اور تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ نئے حالات ضرورت کے تحت نئے نظریات اور نئی شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں۔

تاریخی عمل جب آگے بڑھتا ہے تو وہ کسی خاص شخصیت کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ ایک کام ضرور تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ جب یورپ کے معاشرہ میں چودھویں صدی سے تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں تو ان حالات میں انہوں نے تجارت کی غرض سے بحری راستوں کی تلاش شروع کی اور اسی ضرورت کے تحت واسکوڈی گاما اور کولمبس نے نئے راستوں اور ملکوں کو دریافت کیا۔ لیکن اگر یہ نہ ہوتے تب بھی ان راستوں کی دریافت ضرور ہوتی کیونکہ یہ حالات کا تقاضہ اور وقت کی ضرورت تھی، اور جہاں حالات نے انہیں پیدا کیا وہاں یہ کسی اور کو بھی پیدا کر سکتے تھے۔

تاریخی عمل کے ساتھ ساتھ اور وقت کی تبدیلی کی وجہ سے اخلاقی قدریں، روایات اور

ثقافتی و معاشی اور سیاسی ادارے بھی بدل جاتے ہیں۔ غلامی کا ادارہ اس وقت انتہائی ضروری تھا جب کہ معاشرہ زراعتی تھا لیکن جیسے ہی معاشرہ زراعتی سے صنعتی ہوا غلامی کے ادارے کی افادیت ختم ہو گئی اور اس کے خاتمہ کے لئے تحریکیں چلائی گئیں۔ اگرچہ غلامی کے ادارے کے خلاف اس سے پہلے بھی دبی دبی آوازیں اٹھی تھیں مگر ان کو اس لئے حمایت نہیں ملی کہ یہ ادارہ زراعتی معاشرہ کے لئے ضروری تھا' مگر حالات کی تبدیلی اور صنعتی ضرورت نے اس ادارے کا خاتمہ کر دیا۔

ایجادات معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں لاتی ہیں' مثلاً ہندوستان میں جب چرخے کا استعمال شروع ہوا تو بہت سے قبائل جو خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اس کے استعمال کے بعد وہ بستیوں اور شہروں میں آباد ہو گئے۔ مستقل ایک جگہ رہنے کی وجہ سے ان کے طرز معاشرت میں بنیادی تبدیلیاں آگئیں۔ خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے وہ آزاد اور خود مختار تھے' لڑائی' جنگ و جدل اور لوٹ مار میں ماہر تھے' مگر ایک جگہ آباد ہونے کے بعد ان کی یہ تمام عادات بدل گئیں' وہ حکومت کے وفادار ہو گئے' قانون پر عمل کرنے لگے اور امن پسند ہو گئے۔ معاشی حالت کے بہتر ہونے کے بعد انہوں نے ثقافتی اور تہذیبی طور پر بھی ترقی کی اور مہذب معاشرہ کا ایک حصہ ہو کر اس کی علمی و ادبی ترقی میں حصہ لینے لگے۔

چونکہ ایجادات معاشرہ کے پیداوار کے طریقوں کو بدل دیتی ہیں اس لئے اس کے بدلنے سے معاشرہ کی اخلاقیات' اقدار' اور روایات بھی بدل جاتی ہیں اور بحران کے دور کے تحت جو حالات پیدا ہوتے ہیں ان کے نتیجہ میں شخصیتیں وجود میں آتی ہیں اور یہ شخصیتیں ضرورت کے مطابق تاریخی عمل کو تیز تر کرتی ہیں اور اس طرح سے تاریخ بنتی ہے۔

تاریخ کیسے پڑھنا چاہیے؟

تاریخ کو ہر مورخ اپنے خاص نقطہ نظر سے لکھتا ہے' اس لئے واقعات کا بیان اس کی پسند و ناپسند سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تاریخ ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانہ میں لکھی جاتی ہے اور اس کا اثر تاریخی واقعات کے بیان پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ پڑھتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ اس کے پس منظر سے واقفیت ہو سکے۔ سب سے پہلی چیز جس کے بارے میں معلومات ضروری ہیں وہ یہ کہ تاریخ لکھنے والا کون ہے تاکہ قاری اس کے ذہن' تعصبات اور نظریات کے بارے میں واقف ہو سکے۔ اور اس کے نقطہ نظر کو سمجھ سکے۔ مثلاً ابتدائی دور میں تاریخ لکھنے والے یا تو درباری ملازم ہوا کرتے تھے' یا مذہبی عالم۔ اس لئے ان دو شخصیتوں کو ذہن میں رکھ کر ان کی لکھی ہوئی تاریخ کو آسانی سے تنقیدی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے درباری مورخ کبھی بھی حکومت اور حکمران پر تنقید نہیں کرے گا اور واقعات کا انتخاب اس طرح سے کرے گا کہ حکمران کی کمزوری ظاہر نہ ہو بلکہ ہر صورت میں ان کے کردار کا روشن اور اچھا پہلو سامنے آئے۔ اس کی مثال شمس سراج عفیف کی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" سے دی جا سکتی ہے کہ اس نے کس قدر خلوص اور وفاداری کے ساتھ فیروز شاہ کی کمزوریوں کو بھی اس کی خوبیاں ظاہر کر کے بیان کیا ہے۔ مثلاً فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فوج میں رشوت عام ہو گئی تھی' ایک مرتبہ ایک فوجی اپنا گھوڑا معائنے کے لئے پیش نہیں کر سکا کیونکہ اس کے پاس رشوت دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ بادشاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوجی کو ایک اشرفی عنایت کی تاکہ وہ قانونی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ جب یہ ملازم واپس آیا تو بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تیری تمنا پوری ہو گئی۔ تو اس شخص نے عرض کیا کہ خداوند عالم کی عنایت و مہربانی سے میں کامیاب ہو گیا۔ بادشاہ نے اس پر فرمایا "الحمدللہ"۔ اسی طرح جب فیروز شاہ اپنے مخالفوں کے خلاف فوجی اقدامات نہیں کر سکا تو اس کی تعریف مورخ نے اس طرح کی ہے کہ اس نے انسانوں کا خون بہانے سے گریز کیا۔ درباری مورخ کی تاریخ کو پڑھتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بحیثیت ملازم اس نے حکمران کی محض تعریف کی ہے اور یہ پڑھنے والے کا کام ہے کہ بین السطور وہ اس کی کمزوریوں کو ڈھونڈے' مثلاً

شمس سراج عفیف کے ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیروز شاہ کے دور میں انتظامیہ کے افسران اعلیٰ میں رشوت عام تھی اور بادشاہ میں اتنی طاقت و صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس رشوت کو ختم کر سکے اس لئے اس کی نیکی اور غریب پروری یہ تھی کہ وہ رشوت کے پیسے اپنے پاس سے دیتا تھا تاکہ لوگوں کے کام ہو جائیں۔ اسی طرح جب اس نے اپنے مخالفین کے خلاف فوجی اقدامات نہیں کئے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس میں بحیثیت جنرل کے کوئی صلاحیت نہیں تھی اور وہ اپنی فوج پر کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف ایسی تاریخیں بھی ہیں کہ جو ان مورخوں نے لکھیں کہ جو حکمران کی سرپرستی سے محروم رہے اور جو مذہبی عالم بھی تھے۔ ان لوگوں کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو بطور وعظ پیش کیا ہے اور جہاں انہیں موقع ملا ہے انہوں نے صوفیاء اور علماء کی شخصیتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ اس کی مثال دو مورخوں سے دی جا سکتی ہے' ایک ضیاء الدین برنی' جس نے عمر کے آخری حصے میں عہد فیروز شاہ میں "تاریخ فیروز شاہی" لکھی' اور دوسرا عبدالقادر بدایونی ہے' جس نے اکبر کے عہد میں "منتخب التواریخ" لکھی۔ یہ دونوں چونکہ دربار کی سرپرستی سے محروم رہے' اور ان دونوں کو اس کا غم رہا کہ ان کی صلاحیتوں کی پوری طرح سے قدر نہیں ہوئی' اس لئے ان کی تاریخوں میں ان کا احساس محرومی جھلکتا ہے' اور دونوں اپنی ناقدری کا بدلہ حکمرانوں پر سخت تنقید کر کے لیتے ہیں۔ ابوالفضل درباری مورخ کی حیثیت سے اکبر کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے تو عبدالقادر بدایونی اس کی شخصیت میں ہر قسم کی برائی اور کمزوری ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ان کی تاریخ کو پڑھتے وقت پڑھنے والے کو ان دونوں کے نقطہ نظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔

دوسری اہم چیز یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ تاریخ کس زمانے' کس عہد اور کن حالات میں لکھی گئی' مثلاً امیہ عہد کی تاریخ ان کے زمانے میں نہیں لکھی گئی بلکہ یہ عباسی دور میں لکھی گئی' یا سوری خاندان کی تاریخ مغل دور حکومت میں لکھی گئی۔ اس وجہ سے امیہ اور سوری حکمرانوں کو کوئی غیر جانبدار اور حق پسند مورخ میسر نہیں آیا۔ جو ان کا دفاع کر سکتا اور ان کے عہد کے بارے میں تفصیلات دے سکتا۔ مثلاً ابوالفضل جب بھی شیر شاہ کا ذکر کرتا ہے تو اسے شیر خاں کے نام سے موسوم کرتا ہے اور بحیثیت بادشاہ کے اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ ہیمو کو "بقال" لکھتا ہے اور اس کی کسی خوبی اور صلاحیت کا ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ ہیمو نہ صرف بہادر فوجی اور تجربہ کار جنرل تھا بلکہ بہترین منتظم بھی تھا' مگر اس کی شکست نے اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈال دیا اور اس کے کردار کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے

وہ تاریخ میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکے۔

جو حکمران اور قومیں شکست کھا جاتی ہیں' تاریخ میں وہ بھی اپنا جائز مقام حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں' کیونکہ ان کی جانب سے ان کے حق میں دلائل دینے والا کوئی نہیں ہوتا اور فاتحین کی تاریخ لکھنے والے ان سے ہر برائی کو منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال ابراہیم لودھی کی شخصیت ہے' پانی پت کی جنگ میں اس کی شکست کے بعد مغل مورخوں نے اس کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اسے نااہل اور ظالم حکمران ثابت کیا تاکہ مغل حکومت کے قیام کا جواز پیدا ہو سکے۔

جب ہم عصر مورخ تاریخ کو مسخ کر کے لکھتے ہیں تو آنے والے مورخوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تاریخ کی حقیقت پسندی کے ساتھ تشکیل کر سکیں۔ اس لئے تاریخ میں ان کی شخصیت ایسی ہی ابھرتی ہے جیسے کہ ان کے مخالفوں نے پیش کی تھی۔ حجاج بن یوسف کو عباسی دور میں ظالم' اور بے رحمی و خون ریزی کے چاہنے والے کی حیثیت میں پیش کیا گیا اور اس کی تمام نیکیوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ اور آج بھی لوگ اس کو اسی حیثیت سے پہچانتے ہیں' حالانکہ اس کی اصل شخصیت تھی وہ نہیں جو عباسی مورخوں نے پیش کی ہے۔

نقطہ نظر' اور پسند و ناپسند' اور حالات کا اثر جدید تاریخ پر بھی ہے۔ آج بھی تاریخ خاص نقطہ نظر اور خاص مقاصد کے تحت لکھی جا رہی ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ان مختلف نقطہ ہائے نظر کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں کمپنی نے اس قسم کی تاریخیں لکھوائیں کہ جن میں ان کی فتوحات اور سیاسی اقتدار کو جائز قرار دیا گیا۔ چونکہ کمپنی نے ہندوستان کی ریاستوں پر قبضے کئے تھے اس لئے ان ریاستوں کی تاریخ کو اس نقطہ نظر سے لکھوایا کہ جس سے یہ ثابت ہوتا کہ ان کے حکمران نااہل اور نالائق تھے اور ان کے دور حکومت میں ریاست ابتری کا شکار تھی' اس لئے ان پر برطانوی اقتدار ان کے لئے باعث رحمت ہوا۔ 1857ء کے ہنگامے پر جس قدر تاریخیں برطانوی عہد میں لکھی گئیں ان میں انگریزوں کے ہر عمل کو جائز قرار دیا گیا ہے اور سب نے اسے غدر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جب ساورکر نے پہلی مرتبہ اسے "جنگ آزادی" کا نام دیا اور اس موضوع پر کتاب لکھی تو یہ کتاب فوراً ممنوع قرار دے دی گئی۔

پاکستان میں تاریخ پر تحقیقی کام تو بہت کم ہوا ہے' مگر یہاں بھی تاریخ کو خاص نقطہ نظر سے لکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ نویسی کے جدید سائنسی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے اور ہر عہد کی تاریخ کو عوام کے سماجی حالات سے مربوط کیا

جائے۔ جس تاریخ میں عوام کے حالات سے آگاہی نہیں ہوتی اس تاریخ کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

تاریخ اور آج کی دنیا

نوآبادیاتی دور میں برصغیر کی تاریخ کو سامراجی مقاصد کے تحت مسخ کیا گیا اور تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پڑھایا گیا کہ اپنے ماضی سے نفرت ہو جائے اور انگریزی دور حکومت خدا کی جانب سے نعمت کی شکل میں نظر آئے۔ آزادی کے بعد اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت تھی کہ تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کی جاتی تاکہ ہم اپنے ماضی کے بارے میں صحیح اور تنقیدی جائزہ لے سکتے اور اس کی روشنی میں جدید تاریخ اور موجودہ حالات کو سمجھ سکتے۔ نوآبادیاتی عہد میں رقم کی جانے والی تاریخ محض حکمران خاندانوں اور ان کی سیاست تک محدود تھی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اس محدود دائرے سے نکل کر جدید عہد میں تاریخ کے مضمون میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں ثقافتی' معاشی اور سماجی حالات کو پیش نظر رکھا جاتا تاکہ ماضی کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آتی۔

ہمارے ہاں مروج سیاسی تاریخ جنگوں اور سازشوں کا مجموعہ ہے۔ جو نفرت و عناد پیدا کرتی ہے۔ جب کہ ثقافتی تاریخ معاشرتی سرگرمیوں کی عکاس ہوتی ہے جس میں انسانی رابطوں اور رشتوں کا اظہار ہوتا ہے اور جس میں انسانی قدریں اور روایات چھائی ہوئی ہیں۔ اس لئے یہ تاریخ لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے' انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی۔

تاریخ کا علم اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ہمیں اپنے ملک اور لوگوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے اس کے ساتھ ہی عالمی برادری کے حالات جاننے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہم جیسے انسان رہتے ہیں' ان کی ضروریات ان کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز ہم جیسا ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے وہ اور ہم ایک ہیں اور وہ انہی تہذیبی راہوں سے چل کر یہاں تک آئے ہیں جن راستوں سے ہم گزر چکے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد عالمی تاریخ کا مطالعہ اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ اس مطالعہ کے ذریعے ہم دنیا کے دوسرے ممالک کی سماجی تشکیل سے آگاہ ہو کر اپنی خارجہ پالیسی اور تجارتی تعلقات میں مثبت تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر روس اور امریکہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان دونوں ملکوں کے عوام کے ذہن اور فکر سے ہمارے لئے واقف ہونا ضروری ہے۔

تاکہ ان دو بڑی طاقتوں سے تعلقات کو فروغ دیتے ہوئے ہم ان کی تاریخی نفسیات سے آگاہ ہوں۔ اسی طرح ہمارے جاپان سے تجارتی تعلقات ہیں مگر ہمارے بیشتر تاجر جاپان کی تاریخ اور جاپانی قوم کی ثقافت سے واقف نہیں۔ اس لئے وہ ان سے بہتر طریقہ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ اسی صورتحال نے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں بڑی بڑی صنعتوں کی کمپنیوں کے ہاں ایک خصوصی شعبہ ہوتا ہے جو "سیاسی خطرہ" (POLITICAL RISK) کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جہاں جہاں یہ کمپنیاں سرمایہ لگائیں انہیں وہاں کی سیاسی صورت حال، فوجی انقلاب کے خطرہ اور سیاسی تبدیلی سے باخبر رکھا جائے تاکہ کسی خطرہ کی صورت میں ان کا سرمایہ محفوظ رہے۔

پاکستان بننے کے بعد ہم نے تاریخ کے علم کو محض ماضی کی سیاست تک محدود رکھا اور ہم نظریاتی نقطہ نظر، بلکہ کوئی بھی جاندار نقطہ نظر نہ دے سکے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں تاریخ کا علم اپنی کشش اور جاذبیت کھوتا چلا گیا کیونکہ تاریخ کا علم اس وقت تک اپنی افادیت کو قائم نہیں رکھ سکتا ہے جب تک یہ علم کسی معاشرے کی اقدار، روایات اور اداروں کا تنقیدی جائزہ نہ لے اور معاشرے کی تبدیلی پر نظر رکھے۔ اور نقطہ نظر یہ ہے کہ تاریخ نہ صرف ماضی کے صحیح خدوخال اجاگر کرتی ہے بلکہ موجودہ صورتحال کا بھی تعین کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاں جب تاریخ اس فرض کو پورا نہیں کر سکی تو معاشرے کے لئے اس کی کوئی افادیت بھی نہیں رہی۔

تاریخ کو غیر مقبول بنانے میں تعلیمی نصاب کا بڑا دخل ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ کو انتہائی محدود رکھا گیا اور چند کورسز کو بار بار ہر کلاس میں پڑھایا گیا۔ انسانی ارتقاء، قدیم تاریخ، قدیم تہذیبوں کی پیدائش و تعلقات جیسے اہم موضوعات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور زیادہ توجہ برصغیر میں حکمرانوں کے عہد پر دی گئی۔ اس میں بھی تنقیدی تجزیاتی مطالعہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی بلکہ جو مفروضے مورخین نے ایک مرتبہ قائم کر لئے تھے انہیں بار بار دہرایا گیا۔ مثلاً محمد بن تغلق کی حکومت کے دوران حالات کیسے تھے؟ اور اس کے ذاتی خیالات میں کیوں تبدیلی آئی؟ طالب علموں کو محض مورخوں کے صادر کئے ہوئے فیصلے سنا دیئے جاتے ہیں اور انہیں اس بات کا موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ واقعات کے مطالعہ اور تجزیے کے بعد اپنی رائے خود قائم کریں۔

1960ء کی دہائی میں جب تعلیم کے نصاب کو نئے سرے سے تبدیل کیا گیا تو اس مقصد کے لئے امریکی ماہرین کو بلایا گیا۔ انہوں نے ابتدائی جماعتوں میں تاریخ کے مضمون کو ختم کر کے اس کی جگہ معاشرتی علوم کی ابتداء کی جس میں تاریخ اس کا ایک حصہ بن گئی۔ شاید امریکی

ماہرین تعلیم کے لئے تاریخ کا مضمون اتنا اہم نہ ہو کیونکہ ان کے اپنے ملک کی تاریخ بالکل نئی ہے اور ماضی ان کے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر ہمارے لئے تاریخ کا مضمون انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہمارے اردگرد تاریخ بکھری ہوئی ہے اس لئے ہمارے لئے تو تاریخ کا شعور ضروری ہے۔

اس کے علاوہ دوسری کوشش یہ کی گئی کہ پاکستان کے تمام صوبوں کے تعلیمی اداروں میں یکساں نصاب رائج کیا جائے۔ اس کی یہ دلیل دی گئی کہ حکومت کی ملازمین کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں اور یکساں نصاب کی وجہ سے ان کے بچوں کی تعلیم متاثر نہیں ہو گی۔ حالانکہ یکساں تعلیمی نصاب کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ہر صوبہ اور علاقہ میں مقامی حالات اور ضروریات کے تحت تاریخ پڑھائی جاتی ہے تاکہ طالب علموں میں اپنے صوبہ اور علاقہ کے بارے میں معلومات سے دلچسپی پیدا ہو۔ یکساں نصابی تعلیم نے اس کو ناگزیر معلوماتی طریقے کو پیدا نہیں ہونے دیا۔

اسی دور میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ تاریخ کے مرکز ان علاقوں کو بنایا جائے جو اس وقت پاکستان میں ہیں۔ ہندوستان کے مرکزی تصور کی وجہ سے چونکہ تاریخ کا دھارا اسی طرف بہتا ہے اس لئے اس کو بدلا جائے۔ اس مقصد کے تحت "تاریخ پاکستان" کے نام سے تین جلدیں قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید دور پر ملک کے مشہور مورخین سے لکھوائی گئیں لیکن تاریخ کو اس طرح سے مسخ کرنے کی کوشش بری طرح ناکام ہوئی کیونکہ عہد قدیم سے لے کر اب تک برصغیر کی تاریخ اس طرح سے گتھی ہوئی ہے کہ اسے علیحدہ علیحدہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کو چھوڑ کر ہم موجودہ دور میں آزادی کی تاریخ کا جائزہ لیں تو اندازہ ہو گا کہ آزادی کی جنگ ان علاقوں میں لڑی گئی جو پاکستان میں نہیں ہیں اور 1937ء اور 1940ء میں تحریک آزادی پاکستان کے موجودہ علاقوں میں فعال ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے مگر جنہوں نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو فراموش کر دیا گیا۔

موجودہ دور میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ہم اپنی تاریخ کو برصغیر ہندوستان کے پس منظر میں سمجھنے کے بجائے ایک اور تناظر میں دیکھیں۔ چنانچہ لفظ ہندوستان کی جگہ جنوبی ایشیا کی اصطلاح کو رائج کیا گیا۔ وزارت تعلیم کی ہدایات پر اس لفظ کو تمام نصابی کتابوں میں استعمال کیا گیا بلکہ ایک ایکٹ کے ذریعے اس کی خلاف ورزی پر اور نصاب سے روگردانی پر چھ مہینے کی سزا مقرر کی گئی۔

صرف پاکستان کی تاریخ پر توجہ مرکوز کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ فارسی جو اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ پاکستان کی یونیورسٹیوں سے عہد وسطیٰ کے ماہرین ختم ہو گئے۔

تحقیق کے کاموں میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت آئی جب ہندوستان کی تاریخ پر لکھی ہوئی کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی کیونکہ یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ کتابیں ہماری نظریاتی بنیادوں کو کمزور نہ کر دیں۔ اس وجہ سے ہمارے محققین اس کام سے بے خبر رہے جو ان کے پڑوسی ملک میں ہو رہا ہے اور تحقیق کی بے خبری نے انہیں اپنی دنیا میں محدود رکھا۔

تاریخ کا وسیع تناظر میں مطالعہ نہ کرنے سے ہم عالمی صورت حال اور اپنے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف طاقتوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتے اور نہ ہی اپنے ملک کے حالات و بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی مثال اس سے دی جا سکتی ہے کہ جب بنگال ہم سے علیحدہ ہوا تو ہمارے ملک کی اکثریت اس شدید دھچکے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی کیونکہ ہمارے شہری اس صحیح تاریخی پس منظر سے واقف نہیں تھے جو پاکستان بننے کے بعد وہاں تشکیل ہوا تھا۔

یہی صورت حال آج بھی ہے کہ ہم پاکستان کے چاروں صوبوں کی تاریخ اور وہاں کے بدلتے ہوئے حالات سے ناواقف ہیں، اس لئے حالات کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے عالمی اور ملکی تاریخ سے آگہی نہایت ضروری ہے۔ تاریخ کو نفرت و تعصب پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس سے تعمیر و تشکیل کا کام لیا جائے۔

تاریخ اور نصابی کتب

تعلیم حاصل کرنے کے عمل میں نصابی کتابوں کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہوتی ہے کہ ان ہی کتابوں کے ذریعہ طالب علم ابتدائی کلاسوں میں اپنے نظریات و خیالات تشکیل دیتے ہیں جو بعض اوقات ان کی پوری زندگی میں تبدیل نہیں ہوتے کیونکہ اکثریت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف شعبوں اور پیشوں میں مصروف ہو جاتی ہے اور مختلف مضامین میں ہونے والی تحقیق اور نئی دریافتوں سے وہ ناواقف رہتی ہے۔ اس لئے ان کی معلومات انہی نصابی کتابوں تک محدود رہتی ہے جو انہوں نے ابتدائی زمانہ میں پڑھی ہوتی ہیں۔

نصابی کتابوں کی اس اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ترقی یافتہ ملکوں میں ہر مضمون کی نصابی کتاب کو برابر تبدیل کیا جاتا رہتا ہے اور بہتر یہ نصابی کتابیں کئی مصنفین سے تیار کرائی جاتی ہیں تاکہ مضمون کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی معلومات وقت کی رفتار کے مطابق ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے نظام تعلیم میں نصاب کی کتابوں کی تیاری میں ان میں سے کسی بات کا خیال نہیں کیا جاتا اور یہ کتابیں سیاسی ضرورتوں کے تحت تیار کرائی جاتی ہیں تاکہ جو بھی سیاسی نظام ہو اس کے نقطہ نظر سے طالب علم کے ذہن کو تیار کیا جائے۔ خصوصیت سے تاریخ اس لحاظ سے سب سے زیادہ اس کا شکار ہوتی ہے اور واقعات کو مسخ کر کے ایک مخصوص نقطہ نظر کو ذہنوں پر ٹھونسا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نقطہ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب نصاب کی کتابوں میں اس قسم کا مواد ہو گا جو طالب علم کی معلومات کی راہیں بند کر دے گا تو اس کے نتیجہ میں تنگ نظری، کم علمی اور متعصبانہ خیالات کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہو گا۔

اسکولوں میں اب تاریخ کو علیحدہ مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھایا جاتا لیکن جو کچھ بھی تاریخ کے نام پر پڑھایا جاتا ہے اس سے تاریخ کا واسطہ کم ہی ہے۔ اس وجہ سے طالب علموں میں تاریخ کے بارے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے کیونکہ جب تک تاریخ کے بنیادی تصورات سے طالب علم کو واقفیت نہیں ہو گی اس وقت تک وہ تاریخ کے عمل کو نہیں سمجھ

سکے گا اور اس میں تاریخ کا کوئی شعور پیدا نہیں ہو گا۔ کیونکہ تاریخ صرف واقعات ہی کا نام نہیں اس کے پس منظر میں تہذیب کا ارتقاء' نشوونما اور ترقی کا پورا عمل ہے۔ اس عمل سے تب ہی آگہی ہو سکتی ہے جب کہ انسان کی ابتداء' تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں پتہ ہو۔ طالب علم کو دنیا کی اہم اور بڑی تہذیبوں کے بارے میں معلومات کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس سے واقف ہو کہ انسانی تہذیب کن کن مراحل سے گزر کر ترقی کے اس مرحلے تک پہنچی ہے۔ اگر طالب علم کو ابتدائی مرحلہ میں تہذیبوں کی پیدائش و ارتقاء کے بارے میں پڑھایا جائے تو اس سے اس کا ذہن وسیع ہو گا اور وہ تنگ نظری سے نکل کر اس چیز کو محسوس کرے گا کہ دوسری تہذیبوں میں بھی علم کے خزانے ہیں اور ہم نے بہت سی روایات کو ان ہی سے لیا ہے۔ ہمارے اسکولوں میں تاریخ کا نصاب اس ضرورت کو پورا نہیں کرتا جس کی وجہ سے طالب علم کی معلومات عالمی تاریخ کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

نصاب کی کتابوں میں جو مواد دیا جاتا ہے اسے نئی تحقیق کی روشنی میں نہیں لکھا جاتا اور تاریخ کے مضمون میں جو بھی تبدیلیاں آرہی ہیں اور نیا مواد دریافت ہو رہا ہے اس سے طالب علم ناواقف رہتا ہے۔ اس وجہ سے تاریخ میں جو غلط فیصلے پہلے سے کر لئے گئے تھے ان ہی فیصلوں کو آج تک ان نصاب کی کتابوں میں دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً اکبر کے بارے میں نصاب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ اس نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب جاری کیا تھا۔ یہ رائے ایک زمانہ میں ایک خاص ذہن اور تنگ نظری کی وجہ سے دی گئی تھی اور اس کے بارے میں مکمل تحقیق اس وقت تک نہیں ہوئی تھی مگر اب اکبر پر جو نئی تحقیقات ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے مذہبی رواداری کو اس وقت اختیار کیا جب وہ پرجوش مذہبی تھا اور راجپوت شہزادیوں سے اس وقت شادی کی جب وہ خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر پیدل زیارت کی غرض سے جاتا تھا۔ نئی تحقیقات کے بعد اب یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ مغل بادشاہوں کے مذہبی خیالات کا ان کی عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اورنگ زیب اگرچہ مذہبی معاملات میں بڑا شدت پسند تھا مگر اس کے دربار میں ہندو منصب داروں کی تعداد اکبر سے زیادہ تھی۔ شیعوں کا مخالف ہونے کے باوجود اس نے انتظامیہ میں انہیں رہنے دیا اور انہیں سنی امراء و علماء کے مطالبے کے باوجود برطرف نہیں کیا۔

اکبر نے جو محضر نامہ جاری کیا تھا اسے ونسنٹ اسمتھ نے عقیدہ معصومیت کہا۔ اس کے ذہن میں یہ لکھتے ہوئے پوپ کی پوزیشن تھی جو ان کے نزدیک معصوم اور مذہبی معاملات میں

صاحب اختیار ہوتا ہے جب کہ اس محضر نامہ میں اکبر نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر اسمتھ کا یہ نظریہ اس قدر مقبول ہوا کہ اب تک کتابوں میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی۔

ایک اور مغالطہ جو ہماری درسی کتابوں میں آگیا ہے وہ یہ کہ اکبر کے الحاد کا مقابلہ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے کیا جو کہ تاریخی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ مجدد الف ثانی کا ذکر جہانگیر کے زمانہ میں آتا ہے۔ اکبر کے بارے میں جو اس پر ملحد ہونے الزام لگایا ہے اس کا بھی تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ہماری نصاب کی کتابوں میں سنہری دور کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مثلاً شاہ جہاں کا عہد مغلیہ دور کا سنہری عہد تھا۔ سوال یہ ہے کہ سنہری عہد کس طبقے کے لئے تھا۔ بادشاہ کی لئے' اس کے امراء کے لئے یا عوام کے لئے۔ کیونکہ اسی عہد میں جب تاج محل' لال قلعہ اور دوسری عمارتیں بن رہی تھیں ہندوستان میں مسلسل قحط بھی پڑ رہے تھے اور لوگ بھوکوں مر رہے تھے اس لئے یہ دور قحط زدہ اور مرنے والے عوام کے لئے تو سنہری نہیں ہو سکتا۔

نصاب کی کتابوں میں عام طور سے مذہبی شخصیتوں کو پرعظمت بنانے کے لئے حکمرانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ سندھ ٹیکسٹ بورڈ کی آٹھویں جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک مضمون بہاؤالدین زکریا پر ہے۔ اس مضمون میں ناصرالدین قباچہ کو جو ملتان اور اچ کا حکمران تھا اسے باغی' غاصب اور ظالم بتایا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ اس نے سلطان دہلی سے بغاوت کر رکھی تھی۔ اس پورے مضمون سے مصنف کی تاریخ سے ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ ناصرالدین قباچہ محمد غوری کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے غلاموں کی طرح اس کا وارث تھا اور جس طرح قطب الدین نے دہلی اور تاج الدین نے غزنہ میں خود مختارانہ طور پر اختیار سنبھالے اسی طرح اس نے ملتان اور سندھ میں خود مختار حکومت قائم کی اس لئے التمش نے اس کی ریاست پر حملہ کیا اس کی حیثیت جارح کی تھی اور قباچہ نے یہ جنگ اپنے تحفظ کے لئے لڑی۔ اس کے علاوہ قباچہ نے ان علماء ادباء اور شعراء کی سرپرستی کی جو منگولوں کے حملوں کے نتیجہ میں وسط ایشیا و ایران سے بھاگ کر اس کے دربار میں آگئے تھے اس نے ان کے لئے اچ اور ملتان میں تعلیمی ادارے قائم کئے اور ان کی مالی امداد کی۔ بدقسمتی سے تاریخ کے حقائق کو نظرانداز کر کے پورے واقعہ کو ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے طالب علم قباچہ کے بارے میں انتہائی خراب رائے قائم کرتا ہے۔

عام طور سے نصاب کی کتابوں میں مختلف شخصیتوں اور واقعات کے بارے میں اپنے فیصلے دے دیتا ہے کہ کون اچھا تھا اور کون برا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم ابتداء ہی

سے ان فیصلوں کی روشنی میں تاریخی شخصیتوں کو دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی یہ رائے آخر وقت تک قائم رہتی ہے۔ اصولی طور پر ابتدائی کلاسوں میں طالب علم کو تاریخی واقعات سے آگاہ کیا جائے اور اس میں یہ تجزیاتی جستجو پیدا کی جائے کہ وہ تاریخی واقعات کی روشنی میں اپنی رائے خود قائم کرے۔

برصغیر کی تاریخ پر اردو میں معیاری نصابی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ان انگریزی کتابوں کے بارے میں سفارش کی جاتی ہے جو تقسیم سے پہلے لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں میں نہ صرف یہ کہ پرانا تاریخی مواد ہے بلکہ یہ ایک مخصوص نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں اور وقت کے لحاظ سے اب یہ اپنی افادیت کھو چکی ہیں مگر چونکہ اردو یا انگریزی میں نئے مواد کی روشنی میں کتابیں موجود نہیں اس لئے ان کتابوں کا ہی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

نصاب کی کتاب لکھنے کے لئے دو باتوں کا ہونا انتہائی ضروری ہے ہم عصر تاریخ یا ماخذوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ان سے نتائج اخذ کئے جائیں، دوسرے اب تک جو بھی جدید تحقیق ہوئی ہے اسے نصاب کی کتاب میں شامل کیا جائے۔ اس نقطہ نظر سے پاکستان میں برصغیر کی تاریخ پر نصابی کتاب نہیں لکھی گئی ہے اور ایسی جدید نصاب کی کتب کی غیر موجودگی میں تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات انتہائی پسماندگی کی حالت میں ہیں اور ہمارے طالب علموں کے ذہنوں میں اب تک غلط تاریخی فیصلے اور مفروضے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آج کل اس بات کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے کہ مضمون کو ہم عصر ماخذوں کی روشنی میں پڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ماخذوں سے اقتباسات لے کر ان کا تجزیہ کیا جائے تاکہ طالب علم اس عہد کی روح سے واقف ہو سکے اور تاریخ کے عمل کو بخوبی سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں بھی اب تک ہمارے ہاں کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ فارسی سے ناواقفیت نے ہم عصر ماخذوں کو طالب علموں کی پہنچ سے دور کر دیا ہے۔

تاریخ کے مضمون سے لاپرواہی میں اس غلط فہمی کو بڑا دخل ہے کہ جس کے ذریعہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ تبدیل نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ جو ماضی میں ہو جاتا ہے وہ اسی طرح رہتا ہے اس لئے تاریخ بھی منجمد رہتی ہے اور ایک بار جو تاریخ کی کتاب لکھ دی گئی اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ واقعہ تو وہی رہتا ہے مگر اس واقعہ پر نیا مواد ملنے پر اس کی ہیئت اور شکل بدل جاتی ہے۔

اس کے بیان کرنے میں جو نقطہ نظر ہوتا ہے اس سے واقعہ کا انداز بدل جاتا ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت جنگ آزادی ہو گئی اور اس کے باغی اب

قومی ہیرو ہیں۔ اس لئے تاریخ بھی وقت اور نظریات کے ساتھ بدلتی ہے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ نصاب کی کتابوں کو بھی مسلسل نئے نظریات اور نئی تحقیق کی روشنی میں لکھتے رہنا چاہیے تاکہ تاریخ کا علم ایک جگہ رک کر نہیں رہ جائے اور تاریخ کے عمل کو کہیں ٹھہرا ہوا نہ سمجھ لیا جائے۔ تاریخ کے مضمون کی افادیت ختم ہونے اور اس کے غیر دلچسپ ہونے میں ہماری نصابی کتابوں کا بڑا دخل ہے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں اور نہ ہی ان کے پاس نئے چیلنجوں کا موثر جواب ہے۔

تاریخ اور شکست

قوموں کی تاریخ میں صرف فتوحات ہی اہم نہیں ہوتیں بلکہ شکستیں بھی ان کی زندگی میں اہم تبدیلیاں لے کر آتی ہیں۔ اس لئے شکست کا تجزیہ، اس کے اسباب و وجوہات اور نتائج کا مطالعہ قوموں کی تاریخ میں انتہائی اہم ہوتا ہے، کیونکہ جب تک اس کا تجزیہ نہیں کیا جائے گا اور اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا جائے گا، اس وقت تک اس سے سبق بھی نہیں سیکھا جا سکے گا، کیونکہ شکست قوم کی بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر اس کے ذریعہ بنیادی کمزوریوں کی نشاندہی کی جائے، تو قوم ان کمزوریوں کو دور کر کے معاشرے کے بنیادی ڈھانچہ کو بدل سکتی ہے، اور یہ تبدیلی قوم کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہے۔

تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ شکست کے بعد قوموں میں سیاسی، معاشی اور سماجی شعور پیدا ہوا۔ یورپی تاریخ میں اس کی مثال جرمنی کی ہے کہ جب نپولین نے آسانی کے ساتھ جرمن ریاستوں کو شکست دے دی اور جرمن فرانسیسیوں کے مفتوح ہو گئے تو ان شکستوں نے جرمن قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے بعد ہی سے ان میں قوم پرستی کا جذبہ ابھرا جس کے زیر اثر لوگوں نے نہ صرف جرمن ریاستوں کو متحد کر کے ایک جرمنی کی بنیاد ڈالی بلکہ تاریخی و ثقافتی طور پر قومی احساس کو بیدار کر کے قومیت کی جڑوں کو مستحکم کیا۔ اس عمل میں سیاستدانوں، ادیبوں، شاعروں اور مورخوں نے حصہ لیا اور جرمن قوم و جرمن ثقافت کی نئے سرے سے تشکیل کی۔ قومیت کے زیر اثر جرمنی یورپ میں ایک قوت بن کر ابھرا اور 1871ء میں فرانس کو شکست دے کر اپنی بالادستی کو دوبارہ قائم کر لیا۔

اس کی دوسری مثال ترکی کی ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی کو شکست ہوئی اور اتحادیوں نے اس کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنا لیا، تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ترکی بحیثیت آزاد ملک کے ختم ہونے والا ہے، لیکن جب اتحادیوں کے زیر اثر یونان نے اس پر حملہ کیا اور اس کے شہروں پر قبضہ کر کے آبادی کا قتل عام کیا، تو ترک اس شکست کو برداشت نہیں کر سکے اور ان پر جو مایوسی اور بے حسی کی کیفیت طاری تھی وہ دور ہو گئی۔ اور حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کے لئے قوم میں نئے سرے سے حوصلہ اور جرات پیدا ہو گئی۔

کمال اتاترک کی رہنمائی میں انہوں نے نہ صرف یونانیوں کو شکست دی، بلکہ اتحادیوں کے ساتھ بھی اپنی شرائط پر نیا معاہدہ کیا اور دنیا کی اقوام میں ایک باعزت مقام حاصل کیا۔

ان دونوں مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شکست کے بعد بھی قوموں کی طاقت و توانائی ختم نہیں ہو جاتی۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ قوموں کی اس اندرونی اور مخفی توانائی کو استعمال کیا جائے، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب قوموں میں بحیثیت مجموعی یہ احساس ہو کہ وہ قومی جدوجہد میں حصہ لے رہی ہیں جس کے نتیجے میں وہ بحیثیت قوم فائدہ اٹھائیں گی اور یہ کہ ان کی یہ جدوجہد صرف چند افراد اور طبقوں کے لئے نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے جو تباہی و بربادی پھیلائی اس نے فتح مند اور شکست خوردہ دونوں قوموں کو متاثر کیا۔ مگر خاص طور سے جرمنی کو اس شکست نے تبدیل کر کے رکھ دیا کیونکہ جرمنی صرف جنگ کے دوران ہی تباہ و برباد نہیں ہوا بلکہ ہٹلر کی حکومت کے دوران فاشزم کے ہاتھوں جرمنی کے تمام ادارے متاثر ہوئے، اس لئے جنگ کے بعد شکست نے جرمن قوم کو غور و فکر کرنے اور سوچنے کا موقع دیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ ان کے ملک میں فاشزم کی جڑیں کیوں مضبوط ہوئیں؟ اور ہٹلر کیوں ایک طاقتور آمر کی حیثیت سے ابھرا؟ اور یہ کہ اب آئندہ جرمنی کو کس طرح اس قسم کے فاشزم اور آمرانہ طرز حکومت سے بچایا جائے۔

جرمن دانشوروں نے فاشزم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ جرمنی میں جمہوری روایات اور اداروں کی بنیادیں گہری نہیں تھیں، جس کے نتیجے میں آمرانہ قوتوں کو ابھرنے کا موقع ملا، اور انہوں نے ریاست پر قبضہ کر کے اس کے تمام اداروں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا۔ لہٰذا فاشزم کے ابھرنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے ان دانشوروں کے نزدیک سب سے زیادہ ضروری اور اہم قدم یہ تھا کہ جرمنی میں جمہوری روایات و اقدار کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے اور حکومت و ریاست کے تمام معاملات میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے تاکہ اس جمہوری عمل کو کوئی آمرانہ طاقت ختم نہ کر سکے۔ اس لئے جنگ کے بعد سے جرمن معاشرہ میں ہر سطح اور ہر پہلو میں جمہوری اداروں کو فروغ دیا گیا، ہر ادارے میں کام کرنے والوں کی یونین بن گئی اور ہر کام بحث و مباحثہ کے بعد ووٹنگ کے ذریعے ہوتا ہے تاکہ اختیارات کسی ایک شخص کے ہاتھوں میں جمع نہ ہوں۔ جمہوری اداروں کی یہ نشوونما جرمن شکست کا نتیجہ ہے اور ان کی یہ خواہش ہے کہ اس جمہوری عمل کو اس قدر مستحکم اور توانا بنا دیا جائے کہ آئندہ نہ تو آمریت قائم ہو سکے اور نہ ہی وہ جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا کریں۔

یہی صورت حال جاپان کی تھی کہ جنگ میں شکست کے بعد جاپانیوں نے بھی اپنے معاشرہ کے ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل کیا' اور جمہوری عمل کے ذریعے پوری قوم میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر کے عوام کی صلاحیتوں کو صنعتی ترقی میں استعمال کیا۔

لیکن شکست قوموں کے لئے اسی وقت رہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے جب قوم اپنی شکست اور اس کے اسباب کا تجزیہ کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شکست کو تسلیم کرلے' اور اس کے بعد ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اپنے سیاسی' سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل کرے' کیونکہ اس کے بغیر نہ تو معاشرہ میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی معاشرہ شکست سے کوئی سبق سیکھ سکتا ہے۔

جب ہم اپنی تاریخ میں بنگلہ دیش کی علیحدگی اور اپنی شکست کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے بعد یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس شکست کے بعد ہمارے معاشرہ میں کیا تبدیلی آئی' اور ہم نے اس سے کیا سبق حاصل کیا؟ کیا ہم نے اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں کی نشان دہی کی' اور کیا اس شکست نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہم اپنے سیاسی' سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بدلیں اور جمہوری روایات کو فروغ دے کر آئندہ ہونے والی شکستوں کو روکیں؟

تاریخ اور احساس جرم

اقوام عالم کی تاریخ جنگ و جدل' قتل و غارت گری اور خون ریزی سے بھری پڑی ہے۔ قومیں ایک دوسرے پر حملہ کرتی رہی ہیں جس کے نتیجہ میں بے گناہ لوگوں کا قتل' مذہبی عبادت گاہوں کی بے حرمتی' مال و دولت کی لوٹ کھسوٹ' اذیت اور ایذا رسانی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ جب حملہ آور افواج مال و دولت لے کر واپس اپنی سرزمین میں جاتی تھیں تو ان کا استقبال بحیثیت فاتح کیا جاتا تھا۔ فتح و کامرانی کے نشہ میں کسی کو ان مظلوم لوگوں کا خیال نہیں آتا تھا جن کے خون سے ہولی کھیل کر یہ مال حاصل کیا گیا تھا۔ فتح کے بعد ہمیشہ احساس فخر ہوتا ہے' احساس جرم نہیں' اور یہی ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اس لئے یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوموں میں یہ احساس جرم کیوں نہیں پیدا ہوا؟ جب کہ انہوں نے بعض اوقات بلاجواز اپنے ہمسایہ ملکوں پر حملے کئے اور ان کی زمینوں اور مال و دولت پر طاقت و قوت سے قبضہ کر کے انہیں بے دخل کر دیا' لیکن انہیں کسی ایک لمحہ بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ انسانیت کے خلاف جرم کر رہے ہیں۔ ان حملوں اور فتوحات کے پس منظر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ ہوتا تھا جو ان کے حملوں' قتل و غارت گری' اور لوٹ مار کے لئے جواز فراہم کرتا تھا اور جس کی وجہ سے انہیں یہ یقین کامل تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے ذریعے ایک مشن کی تکمیل ہو رہی ہے۔ دوسری جانب مظلوم و مفتوح قومیں اپنی ذلت اور بربادی کو عذاب الٰہی سمجھتی رہیں اور اپنی مصیبتوں کو گناہوں کی سزا کے طور پر برداشت کرتی رہیں' جس وقت چنگیز و ہلاکو نے وسط ایشیا اور ایران میں تباہی پھیلائی تو مسلمان اس کو خدا کی جانب سے بھیجا ہوا عذاب الٰہی سمجھتے رہے۔

فاتحین جب ایسے قتل و غارت گری کو مقدس مشن سمجھ کر سرانجام دیتے تھے تو ان میں احساس جرم پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پرتگیزیوں نے لاطینی امریکہ میں مقامی باشندوں کا اس لئے قتل عام کیا کہ وہ غیر عیسائی تھے اور اس لئے گمراہ تھے' اور ان کا مشن یہ تھا کہ وہاں لوگوں کو عیسائی بنا کر ان کی آخرت کی زندگی کو بہتر بنائیں۔ یورپی اقوام نے امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے مقامی باشندوں کا صفایا کر کے ان کی زمینوں پر اس لئے قبضہ کیا کہ وہ غیر مہذب تھے۔ اس نظریہ

کی بنیاد پر انہوں نے ایشیا، افریقہ کی نوآبادیات میں قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دیا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس پورے عمل میں کہیں بھی ان میں احساس جرم پیدا نہیں ہوا۔ لیکن تاریخ کے نقطہ نظر میں دوسری جنگ عظیم کے بعد تبدیلی آئی کیونکہ اس جنگ کے نتیجہ میں جو ہولناک خون ریزی ہوئی اس نے فاتح اور مفتوح دونوں کو متاثر کیا۔ خصوصیت سے اس جنگ کی ذمہ داری ہٹلر اور اس کی حکومت ٹھہری۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جرمن قوم نے بحیثیت مجموعی اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے جنگی جرائم کا اقرار کر لیا۔ لہذا اس احساس جرم کے ساتھ جرمنی میں اس دور کی جو تاریخ لکھی گئی اس میں انہوں نے فاشزم کی ابتداء ہٹلر کے عروج اور جنگ کی ابتداء اور اس کے نتائج کا تجزیہ کیا۔ اور انہوں نے ان تمام جرائم کو تسلیم کیا جو ہٹلر کے دور میں انسانیت کے خلاف سرزد ہوئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے ان تمام دستاویزات کو محفوظ کر لیا کہ جن سے ان جرائم کی تصدیق ہوتی تھی۔ جرمن مورخوں نے ہٹلر کے دور میں ہونے والے جرائم کو قطعی چھپانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کے حق میں دلائل دینے کی کوشش کی۔

اگرچہ ہٹلر کے ساتھ اس جنگ میں مسولینی کا اٹلی اور جاپان بھی شامل تھے مگر اٹلی میں مسولینی کے خلاف بغاوت ہوئی اور پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح اہل اٹلی نے اپنے جرائم کا کفارہ ادا کر دیا۔ جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بموں نے جو تباہی مچائی تو اس کے نتیجہ میں اس کے وہ مظالم جو اس نے مشرق بعید کے ملکوں میں کئے تھے وہ پس منظر میں چلے گئے اور ان میں اپنے جرائم کے بارے میں احساس جرم نہیں ہوا۔ لیکن جرمنوں کے احساس جرم نے جرمنی کی تاریخ اور اس کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ انہوں نے اس کا بھرپور تجزیہ کیا کہ جرمنی میں ہٹلر اور فاشزم کن حالات میں پیدا ہوئے اور اب آئندہ اس عمل کو کیسے روکا جائے؟ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنگ کے نتیجہ میں جو تجربات حاصل کئے۔ ان تجربات نے انہیں دنیا میں امن اور آزادی کا احساس دلایا۔ اس ذہنی شعور کی وجہ سے جرمنی میں ان لوگوں کی کوئی عزت نہیں رہی جن کا نازی پارٹی اور ہٹلر کی حکومت سے کوئی تعلق رہا ہو۔ نازی کی اصطلاح ظلم و جفا کی ایک علامت بن گئی۔

اس احساس جرم کا اعتراف جرمنوں نے کیا اگرچہ اس حد تک دوسری قوموں نے تو نہیں کیا مگر اس کے اثرات تاریخ پر دوررس ہوئے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ کی شمولیت اور ان کے مظالم کے خلاف امریکی قوم نے زبردست تحریک چلائی اور احساس جرم کے زیر اثر اس جنگ کے خلاف بڑے بڑے مظاہرے ہوئے جس کے نتیجہ میں آخر کار امریکہ کو جنگ بند

کرنی پڑی۔

اب احساس جرم کے اس جذبہ کے ساتھ اب پوری تاریخ کی تشکیل نئے نقطہ نظر سے ہو رہی ہے۔ یورپی اقوام نے نوآبادیاتی دور میں جو مظالم کئے تھے اب نہ صرف انہیں تسلیم کیا جا رہا ہے بلکہ ان جرائم کا اعتراف بھی کیا جا رہا ہے۔

تاریخ کو بدلنے کے لئے اور دنیا سے جنگ و خون ریزی کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فاتحین اور ظالموں میں احساس جرم پیدا کیا جائے کیونکہ اس کے بعد یہ ممکن ہو گا کہ جنگ اور تشدد سے پرہیز کریں گے اور اسی صورت میں دنیا میں پائیدار امن قائم ہو سکے گا۔

تاریخ اور تحریکیں

انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ انسانی معاشرہ سے ظلم و ستم اور استحصال کو ختم کیا جائے اور ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کیا جائے جس میں امن و انصاف ہو اور انسان دکھوں سے نجات پا کر سکھ کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ انسان کی اس خواہش کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ طبقے ہوتے ہیں جو معاشرے کے تمام وسائل پر قابض ہوتے ہیں، جن کے پاس قوت و طاقت ہوتی ہے اور جو نہیں چاہتے کہ ان کی اعلیٰ و برتر حیثیت ختم ہو اور وہ مراعات سے محروم رہیں، اس لئے معاشرہ میں طبقاتی کشمکش کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے۔

اس صورت میں جب کہ معاشرے کی اکثریت کو اپنے حقوق نہیں ملتے، ان پر انصاف کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور انہیں زندگی کی آسائشوں سے محروم کر دیا جاتا ہے تو اس صورت حال میں ان کی جانب سے دو قسم کا رد عمل پیدا ہوتا ہے، ایک یہ کہ انہیں اس دنیا اور اس دنیا کے کاروبار سے نفرت ہو جاتی ہے، اور دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسے نظام کے خلاف کہ جس میں ان کے لئے کوئی باعزت مقام نہیں، احتجاج کرتے ہیں۔ اور اس نظام کی تمام روایات و اقدار اور اداروں کو رد کر دیتے ہیں۔

پہلی صورت میں جو رد عمل پیدا ہوتا ہے، اس میں انسان کی بے بسی، لاچاری اور مجبوری ہوتی ہے۔ اسے اپنی جدوجہد کے نتائج نکلتے نظر نہیں آتے، اس کے چاروں طرف روایات کی اس قدر رکاوٹیں نظر آتی ہیں کہ وہ انہیں توڑنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ زندگی کی سہولتیں اور آرام و آسائش اس کے لئے خواب بن جاتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں وہ صرف ترک دنیا کے ذریعے اپنے سکون کا راستہ تلاش کر سکتا ہے، اور اسی ذریعہ سے وہ زندگی گزارنے کا حوصلہ کرتا ہے کہ جس میں دنیا کے مصائب کو صبر و شکر کے ذریعے برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ہو، اور اسی لئے وہ دنیاوی تعلقات توڑ کر ریاضت، اور اپنے نفس کو مارنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اور نظریات چونکہ معاشرہ کے اعلیٰ طبقوں کے نظام کے لئے خطرناک نہیں ہوتے اس لئے انہیں برداشت کر لیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا رد عمل مزاحمتی اور ناراضگی کا ہوتا ہے اور ایک ایسے معاشرے

کہ جو عوام کو انصاف نہیں دے سکے، اور اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم کر کے انہیں بدتر حالت میں رکھے، اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایسی تحریکیں اٹھتی ہیں، جو معاشرہ کی تمام روایات، اقدار اور اداروں کو بنیادوں اور جڑوں سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہیں اور لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے معاشرہ کا قیام عمل میں لایا جائے کہ جس میں تمام افراد کو مساوی حقوق ملیں۔

ان تحریکوں میں ایسے تمام طبقے شامل ہوتے ہیں جو معاشرہ کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق نچلے درجے کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ یہ تحریکیں خصوصیت سے اس وقت مقبولیت حاصل کرتی ہیں جب معاشرہ میں جنگ، قحط، سیلاب اور آفات کے نتیجے میں اکثریت معاشی بدحالی کا شکار ہوتی ہے اور ان میں عدم تحفظ کا احساس زیادہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں معاشرہ کی اکثریت کا رشتہ بالائی طبقات کے نظام سے کمزور ہو جاتا ہے اور انہیں اس نظام سے نفرت ہو جاتی ہے جو انہیں ان مصیبتوں سے نجات دلانے میں ناکام رہا۔ اس نفرت کا اظہار وہ اس نظام کی ہر چیز کو رد کر کے کرتے ہیں۔

چونکہ ایسی تمام تحریکیں، اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظریات، خیالات بالائی طبقوں کے لئے ایک چیلنج ہوتے ہیں اس لئے وہ انہیں فوری طور پر کچل کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ابتداء میں عام طور سے ان تحریکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں تاکہ معاشرہ کے لوگ ان سے بدگمان ہو کر ان سے قطع تعلق کر لیں اور جب لوگوں کو ان سے دور کر دیا جائے تو حکومت اس گروہ کو آسانی سے ختم کر سکے۔

جب بھی معاشرہ میں ایسی احتجاجی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو معاشرہ کی اقدار اور ضروریات سے انکار کرتی ہیں تو اس کی تہہ میں معاشرے کی ناانصافیاں ہوتی ہیں اور مظلوم افراد معاشرے کی جگہ ایک ایسا نظام لانا چاہتے ہیں کہ جس میں وہ عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ تاریخی شعور کے ساتھ اب مایوس ہو کر دنیا کو چھوڑ دینے کا رجحان کمزور ہو گیا ہے اور اس کے بجائے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔

تاریخی شعور

انسانی معاشرہ کی ساخت بڑی پیچیدہ اور مشکل ہے اسی لئے علم کا سب سے بڑا حصہ انسان' اس کے افعال اور اس کی ذہنیت کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ تاریخ انسانی عمل اور انسانی معاشرہ کو سمجھنے میں بڑی مددگار ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ماضی میں ہونے والے ہر واقعہ اور تحریک کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس ذریعہ اس تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے کہ کسی خاص مرحلے پر ایک خاص قسم کے افکار نظریات کیوں مقبول ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کے پس منظر میں کون سے طبقات اور جماعتوں کے مفادات ہوتے ہیں۔

تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پڑھنا ضروری ہے کہ واقعات و افکار کے تجزیہ میں طبقاتی گروہی مفادات کو دیکھا جائے۔ ایک مرتبہ جب تاریخی شعور اس قدر پختہ ہو جائے کہ وہ دوسرے کے سماجی' سیاسی اور معاشی عمل میں طبقاتی مفادات کی نشاندہی کر سکے تو پھر نہ صرف ماضی کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے بلکہ حال و مستقبل کے بارے میں بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ماضی میں جو بھی اہم واقعات ہوئے یا تاریخی عمل کے نتیجہ میں جو بھی نظریات و افکار پیدا ہوئے ان میں طبقاتی مفادات نے اہم کردار ادا کیا مثلاً جب یونان اور روم میں غلامی کا ادارہ مستحکم ہو گیا اور حکمران طبقے ان غلاموں کی وجہ سے محنت و مشقت سے بچ گئے تو اب یہ ان کے مفاد میں تھا کہ غلامی کے اس ادارے کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھا جائے اور ایسی روایات و اقدار کو فروغ دیا جائے جن کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ غلام اپنی حیثیت و حالت سے مطمئن رہیں بلکہ معاشرے کے دوسرے لوگ بھی اسے فطری سمجھیں۔ اس وجہ سے یونانی مفکرین اور فلسفیوں نے غلاموں کو عام انسانوں سے مختلف قرار دیا اور کہا کہ انہیں جو بیماریاں ہوتی ہیں وہ بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں غلاموں کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا نہ ہوں اور ان کے ساتھ جو غیر انسانی برتاؤ ہوتا ہے اسے وہ فطری سمجھتے ہوئے جاری رکھیں۔ یہی وہ طبقاتی تقسیم تھی جس کے تحت معاشرہ میں اس نظریہ کو فروغ دیا گیا کہ ذہنی اور جسمانی محنت دو علیحدہ علیحدہ طبقوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ذہنی محنت کرنے والے اعلیٰ

و برتر ہیں اس لئے حکومت کرنے کا حق انہی کو ہے جب کہ جسمانی محنت کرنے والے کم تر اور ذلیل لوگ ہیں اور ان کا کام بالادست طبقہ کی خدمت کرنا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت قدیم ہندوستان میں برہمنوں نے ذات پات کی تقسیم کو پیدا کیا جس میں ان کی بالادستی ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئی۔ یہی نظریہ پورے جاگیردارانہ دور میں بے انتہا مقبول رہا کیونکہ اس کے ذریعہ یہ ممکن تھا کہ کسانوں' مزدوروں اور دستکاروں کو دبا کر رکھا جائے یہاں تک کہ ہاتھ سے کام کرنے والا معاشرہ میں انتہائی حقیر مخلوق سمجھا جانے لگا اور کام کرنے والے سے لفظ "کمی" نکلا جو آج ذلیل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ برہمنوں کی اس بالادستی کے خلاف جب بدھ نے آواز اٹھائی تو اس کا مقصد بھی ذات پات کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ کشتریوں کی بالادستی کو قائم کرنا تھا اس لئے ذات پات کی تقسیم سے کشتری اول درجہ پر آ گئے اور برہمن دوسرے پر۔ یہی وجہ تھی کہ بدھ مذہب کو کشتری حکمرانوں نے قبول کر لیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا سماجی و مذہبی رتبہ بلند ہو گیا۔ مگر دوسری نچلی ذاتوں کی زندگی میں اس سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

جین مذہب اپنی امن پسندی کی وجہ سے ہندوستان کے تاجر طبقہ میں مقبول ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ تاجر طبقہ کی خوشحالی اور تجارت کے فروغ کے لئے امن و امان اور سکون کا ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے وہ ہر اس مذہب اور تحریک کی حمایت کرتے ہیں جس میں انتشار کو دور کر دیا جائے اور جس کے ذریعے جنگ و جدل اور قتل عام کو روکا جائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کے سیاسی عمل کو بھی گروہی اور طبقاتی مفادات کے منظر میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اموی دور حکومت میں مرجیہ اور قدریہ فرقوں کو اس لئے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی کہ ان کے عقائد کے ذریعہ اموی حکومت کو اپنے قیام کا جواز ملتا تھا۔ اموی اور عباسی دور میں ایرانیوں میں قومیت کی ابتداء ہوئی کیونکہ انہیں معاشرے میں مساوی مقام نہیں ملا تھا اس لئے وہ اپنے ثقافتی ورثہ کو عربوں سے برتر ثابت کر کے اپنے احساس کمتری کو دور کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہونے والے واقعات اور تحریکوں کے پیچھے بھی طبقاتی مفادات نظر آتے ہیں۔ بھگتی تحریک اس وجہ سے شروع ہوئی کہ ذات پات کی تقسیم نے نچلی ذاتوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے روک دیا تھا۔ اس لئے نچلی ذات کے کچلے ہوئے لوگوں نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی جدوجہد کی جو ذات پات کی تقسیم سے پاک ہو اور جس میں انسان کا احترام بحیثیت انسان کے ہو۔ چونکہ اس تحریک سے نچلی ذات کے لوگوں کے مفادات وابستہ تھے اس لئے وہ ان ہی تک محدود رہی۔ انہوں نے تعصبات اور تنگ نظری کے خلاف جدوجہد کی

کیونکہ اس کے خاتمہ کے بعد ہی معاشرے میں وہ باعزت مقام حاصل کر سکتے تھے۔

ہندوستان میں مسلمان خاندانوں کے دور حکومت میں عہد سلاطین میں صوفیا کی سرگرمیاں عروج پر تھیں مگر مغلوں کے زمانے میں صوفی زیادہ سرگرم عمل نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہد سلاطین میں مسلمان حکومت کو مکمل طور پر استحکام نہیں ملا تھا اور ہندو راجہ ان کی طاقت کو برابر چیلنج کر رہے تھے، اسلئے انہوں نے صوفیاء کی سرپرستی کی جنہوں نے رواداری کی پالیسی پر عمل کر کے معاشرے میں ایک خوش گوار فضا کو پیدا کیا اور ہندو مسلم کھچاؤ کو کم کیا۔ اس پالیسی کی مغلوں کے زمانے میں اس لئے ضرورت نہیں رہی کہ ان کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی اور اسے سیاسی خطرات لاحق نہیں تھے۔

اکبر کے زمانے میں احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی دربار کے اکثر سنی علماء نے اس لئے سرپرستی کی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت میں راجپوتوں کو زیادہ عہدے دیے جائیں۔

یورپ میں صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں مزدور طبقہ وجود میں آیا جس نے اگرچہ صنعتی ترقی میں حصہ لیا مگر اس ترقی نے اس کی اپنی حالت نہیں بدلی اور وہ انتہائی پس ماندگی کی حالت میں رہا۔

اس کے نتیجہ میں سوشلسٹ نظریات پیدا ہوئے تاکہ مزدوروں کو ان کی محنت کا صحیح معاوضہ ملے اور معاشرے میں انہیں باعزت مقام حاصل ہو۔ سوشلزم کے اس چیلنج کو محسوس کرتے ہوئے جرمنی کے چانسلر بسمارک نے اس بات کا اظہار کیا کہ سرمایہ دار طبقہ کی بقاء کے لئے ضروری ہے کہ سوشلزم کا مقابلہ سماجی اصلاحات کے ذریعہ کرے۔ اس لئے یورپ کی حکومتوں میں مزدوروں کو مراعات دینے کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ اس کے ذریعے سے انقلاب کو روکا جا سکے۔

اگر ہم برصغیر ہندوستان کی موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو یہی گروہی اور طبقاتی مفادات اس کے تاریخی عمل میں نظر آئیں گے۔ سرسید احمد خان نے جب انگریزی حکومت سے مفاہمت کی پالیسی کو اختیار کیا تو اس کا فائدہ مسلمان امراء کے طبقے کو ہوا اور اس ذریعہ سے انہیں حکومت کی ملازمتیں ملنے لگیں۔

اگر تاریخ کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو تاریخی عمل اور واقعات میں طبقاتی و گروہی مفادات کا سراغ لگایا جا سکے گا اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ کون سی تحریکیں اور نظریات اعلیٰ طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں اور کن افکار و خیالات کی بنیاد عوام دشمنی پر تھی اور کون سی تحریکیں عوام کے مفادات کو بچانے کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نقطہ نظر سے

معاشرہ کے طبقاتی مفادات کا ایک ایک پہلو سامنے آجاتا ہے اور اس سے جو تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے اس کی مدد سے ماضی کے تاریخی عمل اور مستقبل کی رفتار سے آگاہی ہو سکتی ہے۔

تاریخ اور سائنسی و فنی ایجادات

ہمارے ہاں تاریخ جس نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہے' اس میں سیاسی واقعات و حادثات کو اہم اور انقلابی سمجھا جاتا ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں تاریخ کا رخ بدل گیا اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ ان واقعات میں اہم جنگیں' شاہی خاندانوں کی تبدیلیاں' مشہور شخصیتوں کی پیدائش اور موت شامل ہیں۔ مثلاً پانی پت کی تینوں جنگوں کا جب بھی تاریخ میں تذکرہ آتا ہے تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان جنگوں نے ہندوستان کی تاریخ کا دھارا بدل دیا لیکن اگر ذرا بھی غور سے دیکھا جائے تو ان جنگوں کی وجہ سے معمولی سیاسی تبدیلیاں ضرور آئیں۔ حکمران بدل گئے اور اقتدار میں نئے لوگ آگئے مگر اس دور میں عوام کی اکثریت ان جنگوں سے بے خبر رہی اور انہیں اس کا پتہ بھی نہیں چلا کہ پانی پت کی جنگ میں کیا ہوا؟ اس لئے ان جنگوں نے ہندوستان کے معاشرے' اس کی ساخت اور بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ لوگوں کا طرز زندگی بالکل نہیں بدلا۔ ان کی رسومات' عقائد اور طور طریق اسی طرح قائم رہے۔

اسی طرح ہندوستان کی تاریخ میں حکمران خاندان بدلتے رہے' سلاطین کے بعد مغل آئے۔ لیکن ان خاندانوں کی تبدیلی سے معاشرہ یکساں رہا' بنیادی طور پر ان کی زندگی' ان کے کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

انفرادی حکمرانوں کی اصلاحات کو بھی ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اکثر اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان اصلاحات کی وجہ سے معاشرہ کا ڈھانچہ بدل گیا۔ مثلاً علاؤالدین خلجی نے جو معاشی و سماجی اصلاحات کیں انہوں نے وقتی طور پر تو معاشرہ کو متاثر کیا مگر اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کی اصلاحات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ نظم و نسق کی اصلاحات اور تبدیلیاں عارضی اثرات چھوڑ کر ختم ہو گئیں اور انہوں نے معاشرے میں گہرائی کے ساتھ کوئی سماجی' معاشی اور ثقافتی تبدیلی نہیں کی۔ اس لئے تاریخ میں سیاسی واقعات اور اصلاحات کو اہمیت دینا اور انہیں تاریخ ساز قرار دینا صحیح نہیں۔

تاریخی عمل کو جو چیز متاثر کرتی ہے وہ سائنسی اور فنی ایجادات ہیں جن کی وجہ سے معاشی

کی معاشی و سماجی اور ذہنی زندگی متاثر ہوتی ہے اور جس کے نتیجہ میں معاشرہ مکمل طور پر تبدیل ہوتا ہے۔ اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی معاشرہ کے نظریات و افکار' روایات و اقدار' رسوم و رواج اور عقائد بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ابتدائی زمانہ میں آباد کاروں کو جب کاشت کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی' تو انہوں نے اس ضرورت کو افریقہ سے غلام در آمد کر کے پورا کیا۔ غلامی کا یہ ادارہ امریکی معاشرہ کا ایک حصہ بن گیا جسے مذہبی و اخلاقی طور پر صحیح ثابت کیا جاتا تھا اور افریقہ کے باشندوں کو غیر مہذب جاہل اور وحشی ثابت کر کے اس بات کا جواز تلاش کیا گیا کہ انہیں بحیثیت غلام کے رکھنا بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ وہ کسی دوسرے باعزت کام کے اہل ہی نہیں ہیں اور اس قابل نہیں کہ معاشرے میں انہیں سفید آدمی کے برابر سمجھا جائے۔ یہ تصورات اور خیالات اس وقت بدلنا شروع ہوئے جب ایسی مشینوں کی ایجاد شروع ہوئی جو ان افریقی غلاموں کی جگہ کاشتکاری کے کام کو کرنے لگیں۔ مشینوں کے اس استعمال کے بعد اب غلاموں کی ضرورت نہیں رہی اور جاگیردار انہیں اپنی معیشت پر بوجھ سمجھنے لگے۔ اس لئے اب یہ نظریہ پیدا ہوا کہ غلامی کا ادارہ فرسودہ اور غیر انسانی ہے اور اسے ختم کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایک طرف جنوبی امریکہ کے لئے یہ بوجھ تھے تو دوسری طرف شمالی امریکہ کے صنعتی اداروں اور فیکٹریوں میں بحیثیت مزدور ان کی ضرورت تھی۔ جب لنکن نے غلامی کے خاتمہ کا اعلان کیا تو یہ بیروزگار غلام ہجرت کر کے روزگار کی تلاش میں فیکٹریوں کا رخ کرنے لگے جس کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھ گئی اور مزدوروں کی کچی آبادیاں جگہ جگہ آباد ہونے لگیں۔ جہاں وہ مفلسی و غربت میں انتہائی پسماندگی کی زندگی گزارنے لگے۔ مگر اس پورے عمل نے ان غلاموں اور مزدوروں کو زبردست ذہنی شعور دیا اور طبقاتی تفاوت کی پوری تصویر ان کے سامنے آگئی۔ یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی میں شہری حقوق کی جنگ عروج پر پہنچ گئی جس نے امریکی معاشرہ کی ساخت و بناوٹ کو بدل دیا۔ اس کے بعد سے یہ کالے باشندے برابر اپنے حقوق کی جنگ کر رہے ہیں اور معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کر رہے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اسی قسم کا عمل اس وقت ہمارے معاشرے میں بھی ہو رہا ہے۔ کاشت کاری میں مشینوں کے استعمال کے بعد کسان اور ہاری بیروزگار ہو رہے ہیں اور یہ بیروزگار کام کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں نہ صرف شہروں کی آبادیاں بڑھ رہی ہیں بلکہ جرائم' بیماریاں اور منشیات کا استعمال بھی بڑھ رہا ہے۔ کچی آبادیوں اور نچلے طبقوں کی محرومیوں کے ساتھ ساتھ دولت مند طبقے کا طرز زندگی طبقاتی تفاوت کو ابھار رہا ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک مرحلہ پر ہمارا موجودہ معاشی و سیاسی نظام ان تفاوات کو برداشت نہیں کر سکے گا اور جب

یہ ختم ہو گا تو اس کے نتیجے میں ایک ایسا نظام آئے گا کہ جو ان تضادات کو ختم کر سکے گا۔

سائنس اور فنی ایجادات نے ایک بہت مختصر عرصہ میں معاشرہ کی ساخت اور ڈھانچہ کو بدل دیا ہے' ذات پات کی تقسیم جو ہمارے معاشرہ میں ہمارے سماجی نظام کا ایک حصہ ہے اور جس کا تعلق مخصوص پیشوں سے ہے اب اس نظام میں بھی سائنس و فنی ایجادات کے بعد تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ مثلاً معاشرے میں گندگی و غلاظت اٹھانے کا کام بھنگی کرتے آئے ہیں۔ صفائی انسانی معاشرے کے لئے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس لئے جب ایک طبقہ جو کہ مفتوح ہو' یا آمدنی کے لحاظ سے پسماندہ ہو' اسے یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا تو اس طبقہ کو بھی معاشرہ نے اس لئے اچھوت بنانا ضروری سمجھا تاکہ وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار نہ کر سکیں۔ اس لئے ان کے لئے تمام دروازے بند کر دیئے اور ایسے تمام مواقع ختم کر دیئے گئے جنہیں استعمال کر کے وہ اپنا سماجی مرتبہ بدل سکیں۔ اس طبقہ کی اس ذلت کو کوئی مصلح ختم نہیں کر سکا اور مساوات کے کسی اصول نے ان کو گندگی و غلاظت سے نجات نہیں دلائی اور صدیوں سے یہ معاشرہ کی انتہائی ذلیل حیثیت سے زندگی گزارتے رہے' مگر سائنس اور فنی ایجادات نے آخر کار مغرب سے اس طبقہ کا خاتمہ کر دیا اور دوسرے انسانی معاشروں میں جیسے جیسے فلش کا استعمال اور سیوریج سسٹم آ رہا ہے اسی طرح یہ پیشہ ختم ہو رہا ہے اور بھنگی کے نام کا وجود آگے چل کر شاید صرف کتابوں میں رہ جائے۔ اور یہ فنی ایجادات ہیں جنہوں نے اس طبقہ کو صدیوں کی ذلت سے نجات دلائی۔ اسی طرح وہ پیشے جنہیں اب تک ذلیل سمجھا جاتا ہے جب انہیں مشینیں کرنے لگیں گی تو اسی کے ساتھ ان پیشوں کا وجود ختم ہو جائے گا اور وہ لوگ جو ان سے متعلق تھے وہ معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنے لگیں گے۔

موجودہ دور میں میڈیسن کی ترقی اور نئی دواؤں کی ایجاد سے بھی انسانی معاشرہ کی ساخت پر بنیادی اثرات ہو رہے ہیں کیونکہ ایک طرف تو ان دواؤں کی وجہ سے بیماریوں کی روک تھام ہوئی ہے اور انسانی زندگی کی مدت بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف آبادی میں اضافے کو روکنے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک وقت دنیا میں بوڑھوں کی تعداد جوانوں سے زیادہ ہو جائے گی اور اس کے سماجی و معاشی و سیاسی اور ثقافتی اثرات نکلیں گے۔ کیونکہ صنعتی ادارے ایسی اشیاء زیادہ بنائیں گے جن کی ضرورت بوڑھے لوگوں کو ہو گی اور ایسا ادب زیادہ آئے گا جو ان کے رجحانات کے مطابق ہو گا اور یقیناً اس سے معاشرہ کی ساخت پر دور رس اثرات ہوں گے۔

یہ سائنسی اور فنی ایجادات جو تبدیلیاں لا رہی ہیں۔ بنیادی اور گہری تبدیلیاں ہیں جن کے

اثرات بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ اس لئے تاریخ کے ذریعہ اس عمل کو سمجھ کر ہم صحیح تاریخی شعور حاصل کر سکتے ہیں۔

تاریخ کی تقسیم

انسان کی سرگرمیوں کو اگر وقت کے اندر سمیٹ لیا جائے تو یہ تاریخ ہے۔ انسان وقت کے دائرہ میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اور یہ تاریخی عمل ایک طویل سلسلہ ہے وقت کے دائرہ میں ہونے والے واقعات زنجیر کی کڑیوں کی مانند ہیں جو برابر طویل ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ تاریخی عمل اور واقعات کا یہ سلسلہ، اس میں یکسانیت نہیں، بلکہ اس میں پیچ و خم بھی ہیں اور نشیب و فراز بھی۔ تبدیلی جو اس سلسلہ کا ایک اہم عنصر ہے وہ ایک عہد کو دوسرے عہد سے اور ایک زمانہ کو دوسرے زمانہ سے جدا کر دیتی ہے۔ ایک عربی کہاوت کے مطابق آدمی اپنے اجداد سے زیادہ اپنے وقت سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس لئے تاریخ کے اس عمل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ وقت کو تقسیم کیا جائے، اور اس عمل میں اس مرحلہ کی نشاندہی کی جائے جہاں سے تبدیلی کا آغاز ہوا تھا یا جہاں سے ایک عہد کی ابتدا ہوئی تھی اور اس کے نتیجہ میں سیاسی و معاشی اور ذہنی و فکری تبدیلیاں آئی تھیں۔

تاریخ کو سمجھنے کے اس عمل میں مورخین نے تاریخ کو مختلف نقطہ نظر سے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ تاریخ کی اس تقسیم سے مخصوص نظریات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً تاریخ کی ایک تقسیم اس طرح سے کی گئی کہ اسے تقویم کے اعتبار سے مختلف ادوار میں بانٹا گیا جیسے قبل مسیح اور بعد مسیح، یا مسلمانوں نے دور جاہلیت اور ظہور اسلام کی اصطلاحوں کے ذریعہ تاریخ کو وسیع تناظر میں تقسیم کیا۔

مذہبی اعتبار سے مسلمانوں نے کہا کہ اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت اور تاریکی کا زمانہ تھا اور یہ اسلام کی آمد کو تاریخ عالم میں ایک ایسا موڑ اور نشان سمجھتے ہیں کہ جس کے ذریعہ تاریکی اور روشنی میں فرق کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ کو مسلمان مورخوں نے اس کے بعد اس طرح سے تقسیم کیا۔ رسول اللہ کے عہد کو سیرت کے ذریعہ بیان کیا۔ اور آپ کے بعد کا عہد خلفائے راشدین کا ہوا۔ اس کے بعد سے تاریخ کا عمل سیاسی خاندانوں کی تبدیلی کے ذریعہ بیان کیا گیا۔ امیہ، عباسیہ، فاطمی، سامانی، غزنوی، آل بویہ، غوری اور سلجوقی۔ ایک کے بعد ایک خاندان آتا ہے اور تاریخی

تسلسل برقرار رہتا ہے۔ مورخ کی ساری توجہ ان خاندانوں کے اقتدار میں آنے اور ان کے زوال پر مرکوز رہتی ہے۔ اسی نمونہ پر ہندوستان، مصر، ایران اور ترکی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ ان حکمران خاندانوں کی تاریخ کو انفرادی حکمرانوں کے دور حکومت میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو ان کی تخت نشینی سے شروع ہو کر ان کی موت تک رہتا ہے۔

تاریخ کو تقسیم کرنے کا دوسرا رجحان یہ ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کا جامع طور پر مطالعہ کیا جائے اور ان کے ارتقاء کو بیان کرتے ہوئے ان کے عروج و زوال کی نشاندہی کی جائے۔ قدیم تہذیبوں کا مطالعہ عروج و زوال کے خاکہ میں اس لئے بھی کیا گیا کہ اس دور کے حکمران خاندانوں یا انفرادی حکمرانوں کے بارے میں معلومات نہیں تھیں، اس لئے سیاسی تاریخ کے مواد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان قدیم تہذیبوں کے ثقافتی و سماجی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا گیا۔

ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ شخصیتیں تاریخ ساز ہوتی ہیں اور ان کے عمل سے ایک پورا عہد متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر مورخوں نے ان شخصیتوں کو مرکز بنا کر پورے عہد کو بیان کیا ہے۔ جیسے اشوک اور اکبر وغیرہ۔

تاریخ میں جب ترقی کا نظریہ آیا تو اس میں یہ فرض کیا گیا کہ انسان مسلسل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور اس کی اس ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ یہ ترقی واضح اور بغیر کسی شکل کے ہے۔ لہٰذا اس سے ذہن میں یہ بات آئی کہ قدیم دور میں انسان غیر مہذب تھا۔ عہد وسطیٰ میں وہ جاہلیت و تاریکی میں تھا، اور جدید دور میں آ کر وہ ترقی یافتہ اور مہذب ہوا ہے۔ لہٰذا اس تصور نے قدیم، قرون وسطیٰ اور جدید کی اصطلاحات کو تاریخ کے اس مخصوص نظریہ کا تابع کر دیا۔ اگرچہ بعد میں اس نظریہ کو رومانوی تحریک نے رد کرنے کی کوشش کی جس نے ماضی کو خوبصورت و دلکش ثابت کیا اور اپنے موجودہ دور کو تہذیب انسانی کے لئے مہلک قرار دیا۔

تاریخ کو فکری اعتبار سے بھی تقسیم کیا گیا۔ جیسے روشن خیالی کا عہد، اور عقلیت کا عہد، یا ان اہم تحریکوں کو مرکز بنا کر ان کے اثرات کو ایک پورے عہد پر ثابت کیا۔ جیسے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح مذہب، فرانسیسی انقلاب، قوم پرستی کی تحریکیں اور صنعتی عہد وغیرہ۔

انقلابی دانشوروں نے تاریخ کے عمل میں ذرائع پیداوار کے ذریعہ تبدیلی کی نشاندہی کی اور اس لحاظ سے انہوں نے دور غلامی، دور جاگیرداری، اور سرمایہ داری کے ذریعہ انسانی تاریخ میں تبدیلی کو ظاہر کیا۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہندوستان کے مورخ کوسمبی نے کہا کہ تاریخ کو جب تقسیم کیا جائے تو اس چیز کو ذہن میں رکھا جائے کہ کس مرحلہ پر معاشرہ میں بنیادی تبدیلی آئی اور معاشرہ کا پورا سیاسی، سماجی، اور معاشی ڈھانچہ بدل گیا۔ یہ صرف اسی صورت میں

ہو سکتا ہے جب کہ تاریخ میں ان مرحلوں کی نشاندہی کی جائے جہاں ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات میں تبدیلی آئی کیونکہ اس کے نتیجہ ہی میں معاشرہ کا مکمل نظام بدلتا ہے۔ اس لئے تاریخ کو سیاسی، فکری اور معاشی سطح پر تقسیم کرنے سے تاریخ کے عمل کو نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ یہ تبدیلیاں بعد میں آتی ہیں

اس وقت خصوصیت سے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے خطہ کی تاریخ لکھیں تو اس میں ادوار کی تقسیم کو مکمل طور پر بدلیں کیونکہ ہماری جدید تاریخ پر نوآبادیاتی دور کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ تاریخ کو مذہبی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ اور برطانوی عہد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ہندوستانی عوام کی جدوجہد اور عمل کا ذکر نہیں۔ اس لئے مغربی ذہن سے آزاد ہو کر ہمیں اپنی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کی ضرورت ہے اور اسے اس طرح سے تقسیم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے فرقہ واریت اور تنگ نظری کے احساسات ختم ہوں اور تاریخ کا ایک وسیع نقطہ نظر ابھر کر ہمارے سامنے آئے

تاریخ اور اقلیت

اقلیت چاہے وہ مذہبی ہو، نسلی، یا ثقافتی، وہ اکثریتی معاشرہ میں خود کو پوری طرح سے نہ ابھار سکتی ہے اور نہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتی ہے اس لئے اقلیت اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے "علامتوں، اشاروں" اور کنایوں کا سہارا لیتی ہے، اور اکثر خود کو اکثریت کا ایک حصہ ظاہر کرتی ہے، لیکن خفیہ طور پر اپنے مذہبی عقائد یا اپنی نسلی خصوصیات کو برقرار رکھتی ہے۔ مثلاً شیعہ تقیہ کے ذریعہ اپنی اقلیتی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں اگر اقلیت کی تعداد اس قدر ہوتی ہے کہ وہ متحد ہو کر خود کو محفوظ رکھ سکتی ہے تو وہ خود کو چھپاتی نہیں ہے، مگر اکثریت سے علیحدہ رہتے ہوئے اپنی روایات و اداروں کو قائم کر سکتی ہے کیونکہ اقلیت کے لئے سب سے بڑا چیلنج بقا کا ہوتا ہے، اور اسے یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ اس کے اراکین کہیں ذاتی مفاد کی خاطر اس کو چھوڑ کر اکثریت میں ضم نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان میں تعاون، ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ، اور برادری کے ساتھ رہنے کی پابندیاں ہوتی ہیں۔

کیونکہ اقلیت کے پاس سیاسی اقتدار نہیں ہوتا ہے اس لئے ان کی کوئی تاریخ بھی نہیں ہوتی ہے۔ تاریخ میں کسی کو اسی وقت دلچسپی پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ تاریخی عمل میں حصہ لیتا ہو، اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ تاریخ کی تشکیل میں وہ بھی برابر کام کر رہا ہے اور اس کا بھی تاریخ میں کوئی مقام ہے۔ اقلیت جب ایک مرتبہ اکثریت سے الگ تھلگ ہو جاتی ہے تو وہ تاریخ کے عمل سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ اسے ہمیشہ اپنی مظلومیت کا احساس ہوتا ہے، اور معاشرے کی روایات، اقدار، اور اداروں میں اسے اپنائیت نظر نہیں آتی، اور نہ ہی اکثریتی معاشرہ انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے، اس وجہ سے اس کا جو ذہن بنتا ہے، وہ یہ کہ "تاریخی عمل" ان کے خلاف ہے اور اس تاریخی عمل میں وہ اپنی خواہشات، جذبات، اور تمناؤں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں، یہ احساسات ان میں تاریخ کے خلاف نفرت پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ یہ تاریخ انہیں معاشرے میں ان کا جائز مقام نہیں دیتی۔ اور وہ اکثریتی معاشرہ میں محروم اور ٹھکرائے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اچھے مستقبل کی خواہش جو انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے، وہ خواہش جب پوری نہیں ہوتی تو وہ تاریخ سے بے تعلق ہو جاتے ہیں، اور

اکثریتی تاریخ سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے' وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب تاریخ کا دھارا بدلے گا اور کب انہیں معاشرہ میں ان کا جائز مقام ملے گا۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ اقلیت کی تاریخ محدود ہو کر صرف ان نشانیوں تک رہ جاتی ہے جو مستقبل کے بارے میں ہوتی ہیں' اس لئے ان کے ہاں ماضی کو چھوڑ کر مستقبل کے خوشگوار ہونے کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں اور اس کے سہارے وہ زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

اکثریتی تاریخ سے لاتعلقی کے اور کئی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مذہب یا نسل کے لوگ ایک ملک میں بحیثیت اقلیت کے ہیں تو کسی دوسرے ملک میں وہ اکثریت میں ہوں گے' جیسے شیعہ اکثر ملکوں میں اقلیت میں ہیں مگر ایران میں ان کی حکومت ہے۔ ایسی صورت میں یہ اقلیتیں اپنی وفاداری کا مرکز ان ملکوں کو بنا لیتی ہیں جہاں ان کے ہم مذہب یا نسل کے لوگ حکومت کرتے ہیں اور انہیں ان ملکوں کی تاریخ میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خود کو اس کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے درمیان مسلمان اقلیت بھی اسی کا شکار ہے۔

اٹھارویں صدی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں قومیت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں نے اقلیتوں کو بھی متاثر کیا' اور ان میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور پیدا ہوا اور انہوں نے بھی اپنی شناخت اور حقوق کے لئے تحریکیں شروع کیں۔ اس مرحلہ پر انہیں احساس ہوا کہ بغیر تاریخ کے اور ماضی میں جائے بغیر اور اپنی تاریخ کی تشکیل کے بغیر' وہ نہ تو اپنی شناخت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے حقوق کے لئے جنگ کر سکتے ہیں اس لئے اس ضرورت کے تحت مختلف اقلیتوں نے اپنی تاریخ کی تلاش شروع کی۔

اقلیت کی تاریخ نویسی کا ایک اہم رجحان یہ رہا کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو "ہیرو اور غدار" کے آہنگ میں لکھا ہے۔ کیونکہ اقلیت کا سب سے بڑا ڈر یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ اکثریت کے دباؤ کے تحت گھٹ گھٹ کر ختم نہیں ہو جائے' اور اس میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہو جائیں جو اس کو اندر سے ختم کر دیں۔ اس لئے انہوں نے تاریخ میں ان شخصیتوں کو ابھارا' اور ان کے کارنامے بیان کئے جنہوں نے اپنی برادری کی خاطر جان دی یا قربانی دی۔ ایسی شخصیتیں' اقلیت کے لئے اتحاد' ایثار' اور مقصد کی علامت بن گئیں' اور ان کی کوشش ہوئی کہ ایسے ہیروؤں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دریافت کی جائے تاکہ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے لوگوں کو حوصلہ دیں' اور لوگ مقصد کی خاطر قربانی کے لئے تیار رہیں اور ان میں جوش' ولولہ' اور

جذبہ پیدا ہو۔

اس کے برعکس ایسے لوگ جنہوں نے ذاتی مفاد' لالچ' اور خود غرضی کے تحت اپنی برادری سے غداری کی' ان کے کردار اور اس کی برائیوں کو خوب ابھارا گیا اور ان کا ذکر حقارت سے کیا گیا تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی وفاداری کو کمزور نہ کریں۔

موجودہ زمانہ میں جمہوریت اور سیکولر روایت نے اقلیتوں میں نہ صرف شعور پیدا کیا ہے بلکہ اکثریت بھی ان کو تاریخی عمل میں شریک کرنا چاہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اب تاریخ حکمران خاندانوں' یا ایک مذہب کے ماننے والوں کی نہیں لکھی جاتی' بلکہ تاریخ اب کسی ملک کی لکھی جاتی ہے' اور جب تاریخ کسی ملک کی لکھی جائے گی تو اس میں اس ملک کے رہنے والے سب لوگ بلا تفریق مذہب' نسل اور ثقافت کے آجائیں گے' جیسے مصر کی تاریخ میں مسلمان' قبطی اور یہودی سب شامل ہیں' اور اس ماضی میں سب کو برابر کا شریک کیا جاتا ہے اور یہ تاریخ نہ صرف قدیم ماضی کو ابھارتی ہے بلکہ جدید دور میں بھی سب کو ساتھ ملاتی ہے۔ تاریخ کے اس سیکولر نظریہ نے اقلیتوں کو با عمل بنا دیا اور انہوں نے جوش کے اور دلچسپی کے ساتھ اپنے اپنے ملکوں کی تاریخیں لکھیں جیسے لبنان' شام' اور مصر کے عیسائیوں نے۔ اس نقطہ نظر سے تاریخ اکثریت اور اقلیت کے اتحاد میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے اور معاشرہ کے لوگوں میں قومی یک جہتی و یگانگت کو پیدا کرتی ہے اور یہ وہ عمل ہے کہ جس کے بعد اقلیت معاشرہ میں الگ تھلگ نہیں رہے گی بلکہ تاریخ کی تشکیل میں اکثریت کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔

تاریخ کی وسعت

مسلمان تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور جاہلیت اور دوسرا اسلام کے بعد کا زمانہ۔ دور جاہلیت سے عام طور سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہ تاریخ کا وہ دور تھا کہ جس میں نہ تہذیب و تمدن تھا، نہ اخلاق و طرز معاشرت کا ارتقاء ہوا تھا۔ نہ رسم و رواج میں شائستگی آئی تھی، اور نہ ہی علم و ادب، فن میں کوئی ترقی ہوئی تھی۔ یہ زمانہ گمراہی اور وحشت و بربریت کا تھا۔ دور جاہلیت کے ان معنوں سے اس تمام ہی تحقیق کی نفی ہوتی ہے کہ جس کی روشنی میں قدیم تہذیبوں کے آثاروں کی دریافت کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ قدیم عہد میں دنیا کے ہر حصے میں مہذب و متمدن اقوام آباد تھیں اور انہوں نے اپنے تخلیقی کارناموں سے انسان کی ترقی میں حصہ لیا۔ اس لئے اگر دور جاہلیت کے یہ معنی لئے جائیں کہ وہ زمانہ کہ جس پر جہالت و گمراہی کا پردہ پڑا ہوا تھا، اور جس کی معلومات ہماری دسترس سے دور تھیں تو اس صورت میں تاریخ کا مفہوم واضح اور صاف ہو سکے گا۔

دور جاہلیت کے تصور نے مسلمان معاشرے کے تاریخی شعور کو بڑا نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اگر اس مفروضہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام سے پہلے دنیا نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ تو پھر ایک ایسے عہد کے مطالعہ کا کیا فائدہ رہے گا جس میں اندھیرے اور تاریکی کے علاوہ کچھ بھی نہیں، اور جس عہد کی روایات و اقدار گمراہی کی وجہ سے انسانی ترقی و فلاح کے لئے قطعی مفید نہیں اور جس کے تمام علمی و ادبی کارنامے کافروں و مشرکوں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے قدیم اقوام اور قدیم تہذیبوں کے بارے میں تحقیق و تجسس کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور ماضی کے لئے حقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ہماری زندگی اور ذہنی ترقی میں ہمارے لئے کسی بھی طرح معاون نہیں ہو سکتی ہے۔

پھر مسلمانوں نے جن جن ملکوں کو فتح کیا وہاں بھی انہوں نے تاریخ کو اسی نقطہ نظر سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ قبل از اسلام، اور بعد از اسلام اور یہاں بھی اس مفروضہ کو فروغ دیا کہ اسلام سے قبل کی تاریخ لایعنی اور فضول ہے۔ مسلمانوں کے لئے تاریخ اس وقت اور اس مرحلہ سے شروع ہوتی ہے جب کہ اسلام نے ان ملکوں کو فتح کیا اور ان کے قدیم نظام کو بدل کر

جدید نظام دیا۔ اسلامی عہد کے بعد ہی سے لوگ گمراہی سے نکلے اور صراط مستقیم پر آئے۔ اس لئے اسلام سے قبل کی تاریخ دور جاہلیت ٹھہری جس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے بیکار ہے۔ اس ذہن کا تسلسل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور اس کے زیر اثر یہ بات کی جاتی ہے کہ پاکستان کی اصل تاریخ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اس خطہ میں جو کچھ ہوا وہ ہمارا تاریخی سرمایہ نہیں، اس لئے ہم ان کے وارث نہیں، بلکہ قدیم ماضی کی تاریخ سے لگاؤ اسلامی ذہن کو تقسیم کرے گا، اور اسلامی تشخص کی پاکیزگی اس سے اثر انداز ہو گی۔

تاریخ کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد مسلمان معاشرے کی لئے یونان، مصر، ہندوستان اور روم کے علوم و فنون "لغو" اور "لایعنی" ہو گئے اور ان تمام تہذیبوں کے کارنامے لایعنی ہو جاتے ہیں۔ ان کی عظمت کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ گمراہ اقوام کے کارنامے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان ملکوں اور اقوام کی تاریخ کہ جہاں اسلام نہیں پہنچا وہ بھی ہمارے لئے قابل قبول نہیں رہتی۔ اس زمرے میں یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرق بعید کے ملک آجاتے ہیں۔

کچھ مسلمان مورخوں نے اس دشواری سے نکلنے کی کوشش ضرور کی مگر ان کی یہ کوشش بحیثیت مجموعی مسلمان معاشرے کے ذہن کو بدل نہیں سکی۔ مثلاً معتزلہ تحریک کے زیر اثر عقلی رجحانات پیدا ہوئے اس کا اطلاق تاریخ پر بھی کیا گیا جس میں المسعودی قابل ذکر ہے، مگر یہ تحریک جلد ہی اشعریوں کی عقل دشمنی کی نذر ہو گئی۔

اس لئے اکثر مسلمان مورخ اس شدید کشمکش میں رہے کہ اسلام سے پہلے کے شاندار زمانہ کو کس طرح سے بیان کیا جائے۔ ابن مسکویہ نے اس کا یہ حل نکالا کہ چونکہ پیغمبروں کی تاریخ انسانی فہم سے بالاتر ہے لہٰذا صرف اس تاریخ کو بیان کرنا چاہئے جو انسانی تجربات پر مبنی ہو۔ اس صورت میں اس پر تنقید ہو سکتی ہے اور اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت اس نے "تجارب الامم" لکھی۔ ابن خلدون نے بھی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے مابعد الطبیعات یا روحانی تاریخ کو علیحدہ کر دیا، اور انسانی تجربوں کی روشنی میں تاریخ کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس لئے یہ کہا کہ معاشرے پیغمبروں کے بغیر بھی ترقی کر سکتے ہیں اور اعلیٰ تمدن پیدا کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ تحریریں مسلمان معاشرے کے اس ذہن کو تبدیل نہیں کر سکیں جو اسلام سے پہلے کے زمانہ کو دور جاہلیت قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کے اس نظریہ نے مسلمان معاشرے کے تاریخی

شعور کو سمیٹ کر ایک تنگ خول میں بند کر دیا۔ اور ان میں وہ وسعت نہیں رہی کہ وہ قدیم اقوام کے کارناموں' اور قدیم تہذیبوں و تمدنوں کے ارتقاء اور عروج کو سمجھ سکیں اور تاریخ کے اس عمل سے واقف ہو سکیں کہ یہ ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے کہ جس کو بیچ میں تقسیم کر کے اگر اس کے بہاؤ کو روک دیا گیا تو دوسرا حصہ خشک و بنجر ہو جائے گا۔

موجودہ دور میں ماضی پر جو تحقیق ہوئی ہے اس نے قدیم ماضی کو بڑی حد تک تشکیل کر دیا ہے۔ سمیری' مصری' ہندوستان' ان کا' مایا' ایزٹک' چینی' یونانی' اور رومی تہذیبوں کے علمی و ادبی اور سائنسی و فنی کارنامے' قدیم آثاروں کی دریافت اور نئے نئے مسودوں کی اشاعت کے بعد منظر عام پر آ چکے ہیں اور یہ شواہد قدیم تہذیبوں کی عظمت' گہرائی اور بلندی کا ثبوت ہیں۔ اس لئے تاریخ کی آگہی اس وقت ہی مکمل ہو سکتی ہے جب کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے ذریعہ انسانی تہذیب و تمدن' ثقافت' اور انسانی ذہن کے ارتقاء کو سمجھا جا سکے۔

اس لئے جو مورخ پاکستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم سے شروع کرنا چاہتے ہیں اور قدیم تاریخ کو بیکار اور لاحاصل سمجھ کر اس کے مطالعہ و تحقیق سے روکنا چاہتے ہیں وہ معاشرے کے تاریخی شعور کو پس ماندہ اور کم تر رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس خطہ کی تاریخ ہزار ہا برس سے وجود میں آ چکی تھی' اور جب تک ہم اس تہذیب کی جڑوں تک نہیں پہنچیں گے اس تہذیب کے ارتقاء کے مرحلوں کو دریافت نہیں کریں گے۔ اس کے پس منظر میں ہم اپنے ذہن کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک ہم اپنی شخصیت کو مکمل نہیں کر پائیں گے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بکھرے ہوئے آثار قدیمہ کی دریافت کی جائے اور اس پوشیدہ عظمت کو گمنامی سے باہر لایا جائے جو زمین میں مدفون ہے۔ قدیم ماضی سے لے کر دور جدید تک انسانی تہذیب کے اس سفر کی کہانی جب تک تشکیل نہیں ہو گی' اس وقت تک ہم اپنے ذہن کو پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اسلام کی فتح بھی اس تاریخی عمل کا ایک حصہ ہے اور اس علاقہ کی تاریخ کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ اس حیثیت سے اسلام کی اس علاقہ میں آمد ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اس کی یہ اہمیت بھی اس وقت اجاگر ہو گی جب ہم اس کے پس منظر سے بخوبی واقف ہوں گے۔

تاریخ میں قوموں کا تصادم

دنیا کی تاریخ میں مادی وسائل کے حصول کے لئے قوموں میں ہمیشہ سے کش مکش اور تصادم رہا ہے۔ یہ جنگیں نہ صرف میدانوں اور وادیوں میں ہوئیں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑی گئیں بلکہ یہ جنگیں ذہنی طور پر خیالات و نظریات کے ذریعہ بھی لڑی گئیں۔ چنانچہ ہر فاتح قوم نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ خود کو ذہنی و نسلی اور جسمانی طور پر مفتوح قوم سے برتر ثابت کرے۔ یہ فرق اس لئے رکھا جاتا تھا تاکہ فاتح قوم خود کو دوسروں سے زیادہ مہذب اور متمدن سمجھے اور اس طرح انسانیت کے درجہ پر خود کو افضل و برتر جاننے لگے۔ اس تصور کے ساتھ اس کے مقابلہ میں دوسری اقوام غیر مہذب' وحشی' جاہل اور غیر متمدن ہو جاتی ہیں۔ جب ایک مرتبہ کسی دوسری قوم کو برابر کا انسانی درجہ نہیں دیا گیا اور اسے مہذب نہیں سمجھا گیا' تو پھر اس کے ساتھ منطقی طور پر تمام غیر انسانی سلوک جائز ہو جاتا ہے۔ انہیں جانوروں سے تشبیہ دے کر انہیں قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب و جائیدادوں کو لوٹنے اور انہیں جلاوطن کرنے میں انسانی جذبات آڑے نہیں آتے کیونکہ انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا تو انسانی جذبات کیوں آڑے آئیں گے۔

انسانی تاریخ میں قوموں کے درمیان سب سے بڑا تصادم سفید اور کالی اقوام کے درمیان نظر آتا ہے۔ آب و ہوا کے فرق کی وجہ سے اور جغرافیائی علاقوں کی وجہ سے رنگ کے اس فرق نے دنیا کی تاریخ میں بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ چونکہ سرد ملکوں کے رہنے والوں کو ہمیشہ سے مادی وسائل کی کمی کا سامنا رہا ہے اس لئے ان ملکوں کی سفید فام اقوام نے گرم اور کالے رنگ کی قوموں کے زرخیز میدانوں اور وادیوں پر حملے کئے اور ان کے مادی وسائل پر قابض ہونے کے لئے قتل و غارت گری اور خون ریزی کو اختیار کیا۔ سفید اور کالی اقوام کے درمیان یہ تصادم بڑا زبردست اور نتائج سے بھرپور رہا اور ان جنگوں نے دونوں کے درمیان نفرت و عداوت کے ایسے جذبات کو پیدا کیا کہ جو وقت کے ہاتھوں بھی نہ ختم ہو سکے۔ ان جنگوں میں فتح و شکست کے بارے میں تو نہیں کہا جا سکتا کہ میدان جنگ میں کون کامیاب رہا اور کس نے آخری فتح حاصل کی لیکن نظریات کی جنگ جو اس تصادم کے نتیجے میں شروع ہوئی اس میں

سفید اقوام نے کالی اقوام کو پراپیگنڈے کے ذریعہ ضرور پسپا کر دیا۔ سفید اقوام نے خود کو برتر سمجھتے ہوئے کالے رنگ کو برائی اور شر کی ایک علامت بنا دیا' اور اس کے بعد سے ہر کالی چیز منحوس ہو گئی۔ چاہے وہ کالی بلا ہو' یا کالی زبان یا کالا دھندا' یہاں تک کہ کالی رات بھی ظلم و ستم کی علامت بن گئی کہ جس کے بعد امید کے طور پر سپیدہ سحر ضرور خوشیوں کا پیغام لائے گی۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں کالے کا لفظ برائی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' اور آج بھی ہمارے ہاں کالی کلوٹی کو بڑی حقارت و ذلت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں کالی اقوام کی طرف سے سفید اقوام کے لئے بھی دو محاورے ہیں اور یہ دونوں اس قدر پر معنی اور جامع ہیں کہ ان کے خلاف سفید اقوام کے پروپیگنڈے کا بھرپور جواب ہیں اور ان دونوں محاوروں سے سفید لوگوں کی ذہنیت خوبصورت انداز میں واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ یعنی "سفید جھوٹ" اور خون کا سفید ہو جانا۔

ہندوستان میں یہ جنگ آریہ اور دراوڑوں کے درمیان ہوئی اور پھر یہ ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی۔ وسط ایشیاء' ایران و افغانستان سے جو حملہ آور آئے انہیں بھی اپنے سفید رنگ پر بڑا فخر تھا اور وہ بھی اپنی نسلی اور سیاسی برتری کی خاطر کالوں سے نفرت کرتے تھے' یہاں تک کہ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے بھی رنگ کی اس برتری کے خیال سے فائدہ اٹھایا اور ان کی نظروں میں کالا ہندوستانی غیر مہذب "گندا" اور ذہنی طور پر کمتر ہو گیا۔ وہ ہندوستانیوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کوئی تہذیب و تمدن کو پیدا کر سکیں۔ اس لئے ایک عام انگریز کی نظر میں تاریخی حیثیت سے ہندوستان کے آثار قدیمہ میں کوئی دلکشی اور عظمت نہیں تھی۔ اس برتری کے جذبہ نے انہیں یہ حوصلہ' ہمت اور جرات دی کہ انہوں نے اقلیت میں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں حکومت کی۔ کالے اور گورے رنگ کا یہ فرق آج بھی ہندوستانی معاشرہ کا ایک حصہ ہے' اور ذہنی طور پر آج بھی اس سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکا ہے۔

رنگ کے بعد قوموں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر فرق کو روا رکھا گیا' چنانچہ ہر مذہب میں مومن اور کافر کے درمیان ایک وسیع خلیج موجود ہے اور ہر مذہبی شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ' پھیلاؤ' اور استحکام کی خاطر کافروں سے جنگ کرے۔ ایسی جنگوں میں کافروں کا قتل اور ان کی جائدادوں پر قبضہ جائز ہوتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے ہر مذہب والا خود کو کافروں کے مقابلہ میں برتر سمجھتا ہے اور اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ ہے اور جب وہ کافروں کو تباہ و برباد کرتا ہے تو دراصل ان کے لئے یہ قہر الٰہی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں

کچھ اقوام خود کو خدا کی پسندیدہ مخلوق سمجھتی ہیں جیسے کہ یہودی' اس لئے وہ کسی دوسری قوم یا مذہب کے لوگوں کو اپنے میں شامل بھی نہیں کرتیں کہ پسندیدہ مخلوق کی تعداد میں کہیں اضافہ نہیں ہو جائے اور کہیں ایسا نہیں ہو جائے کہ ان کے استحصال کے لئے کوئی باقی ہی نہ رہے۔

قوموں کے درمیان استحصال کی ایک اور شکل یہ ہوتی ہے کہ انہیں مہذب اور غیر مہذب کے درجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مہذب کہلانے والی اقوام یہ سمجھتی ہیں کہ تہذیبی برتری کی وجہ سے ان کا حق ہے کہ وہ غیر مہذب اقوام کے مادی وسائل پر قبضہ کر کے انہیں استعمال کریں کیونکہ انہیں اپنے مادی وسائل کی اہمیت سے واقفیت نہیں اور اس طرح سے فطرت کے یہ خزانے جاہلوں کے ہاتھوں میں بے کار پڑے ہیں۔ جب وہ انہیں استعمال کرتے ہیں تو ان کا یہ عمل انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔

اسی نظریہ کے تحت جب یورپی مہذب اقوام نے امریکہ کے براعظم پر قبضہ کیا تو وہاں کے مقامی باشندوں کو غیر مہذب کہہ کر ان کا قتل عام کیا اور ان کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کر کے انہیں بے دخل کر دیا۔ یورپی اقوام اور امریکہ کے مقامی باشندوں کے درمیان جو تصادم ہوا اس کو اگر تہذیب و تمدن کے معیار سے دیکھا جائے تو مقامی ریڈ انڈین باشندے یورپی اقوام سے زیادہ مہذب اور متمدن نظر آئیں گے کیونکہ اگر معاہدوں کی خلاف ورزی اور وعدہ شکنی کی تو یورپی اقوام نے کی اور دھوکہ اور فریب کے ذریعہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ ریڈ انڈین باشندوں کے ترقی یافتہ تمدن کی شہادتیں بھی منظر عام پر آ گئی ہیں مثلاً یہ کہ وہ کپڑے کی صنعت اور زراعت کے طریقوں میں ماہر تھے۔ کپڑا بننے' رنگوں اور ڈیزائنوں کے انتخاب میں جو خوبصورتی ان کے ہاں ہے وہ لا مثال ہے۔ زراعت میں ان سے سفید اقوام نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً مکی' آلو' ٹماٹر' پھلی' مرچیں' انناس اور تمباکو۔ یہ سب نئی دنیا کو پرانے باشندوں سے ملے' جب وہ امریکہ گئے ہیں تو اس وقت ان کے ہاں درختوں کی چار سو اقسام تھیں جن سے اہل یورپ ناواقف تھے۔ انہوں نے امریکی باشندوں سے جو کچھ سیکھا اس کے نتیجہ میں یورپ کی زراعتی پیداوار میں اضافہ ہوا اور انہیں بڑھتی آبادی کے لئے آلو کی شکل میں ایک نعمت مل گئی۔ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اہل یورپ نے تہذیب و تمدن کے نام پر ان کا قتل عام کر کے انہیں اپنے ہی ملک میں اجنبی بنا دیا۔ یہی کچھ انہوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں کیا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ کالے و گورے' مومن و کافر اور متمدن اور غیر متمدن کا فرق کم ہوا تو انہیں جدیدیت کی اصطلاحوں کے ذریعہ آج کی دنیا میں ایک اور شکل دیدی گئی ہے۔

اب اسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام کی زبان میں وہی کہا جاتا ہے جسے ایک زمانہ میں متمدن اور غیر متمدن کے ذریعہ بیان کیا جاتا تھا اور کبھی جنوب اور شمال کی اصطلاح استعمال کر کے اس فرق کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں آج بھی یہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ خود کو افضل اور برتر سمجھ کر کمزور اقوام کے مادی وسائل کا استحصال کیا جائے اور انہیں یہ سوچ نہیں دی جائے کہ وہ خود مختار ہو کر اپنے وسائل سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تاریخ اور بغاوت

بغاوتوں کے ذریعہ تاریخی عمل میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔ بغاوتیں اگرچہ مضبوط اور مستحکم اداروں اور روایات کو کمزور تو کرتی ہیں۔ اور ان کی مضبوطی کو صدمہ تو پہنچاتی ہیں مگر یہ انہیں مکمل طور پر تباہ نہیں کرتیں۔ بغاوتیں ہلچل، انتشار اور بے چینی کو پیدا کرتی ہیں مگر کسی نظام کو بدلتی نہیں۔ اس لئے بغاوت اور انقلاب میں فرق ہوتا ہے جہاں بغاوت ناکام ہوتی ہے وہاں انقلاب کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ مسلسل بغاوتوں کے ذریعہ کسی نظام کو کمزور نہیں کیا جائے، اس پر کاری ضربیں لگا کر اس کی بنیادوں کو ہلا نہیں دیا جائے۔ کسی بھی نظام اور اس کے اداروں کو بغاوتوں کے ذریعہ اس قدر خستہ کر دیا جاتا ہے کہ انقلاب انہیں گرا کر ایک نئے نظام کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی کچھ روس میں ہوا کہ ۱۹۱۷ء کا انقلاب ان لاتعداد بغاوتوں کی پیداوار تھا جو زار کے استبدادی نظام کے خلاف ناکام ہوتی رہی تھیں۔ مگر ہر ناکام بغاوت لوگوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کرتی تھی، ایک نیا حوصلہ دیتی تھی کہ ظالمانہ نظام کے خلاف نئے سرے سے جدوجہد کی جائے اور ان غلطیوں سے بچا جائے کہ جنہوں نے پچھلی بغاوتوں کو ناکام بنایا تھا۔ یہی کچھ چین کے انقلاب میں ہوا کہ اس کے پس منظر میں بھی پچھلی کسانوں کی بغاوتیں تھیں اور انہیں ناکام بغاوتوں نے آخر کار ایک کامیاب انقلاب کی بنیاد ڈالی۔

بغاوتیں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بغاوت میں ملک کی آبادی کا بڑا حصہ شریک نہیں ہوتا، اور شعور کی کمی کی بنا پر وہ اس سے علیحدہ رہتے ہیں اور ایک محدود جماعت اور گروہ حالات سے تنگ آ کر اپنے مسائل کا فوری حل نہ پا کر بغاوت کر دیتے ہیں۔ جب آبادی کی اکثریت ذہنی طور پر بغاوت کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو یہی بغاوت انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

بغاوت کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا دائرہ بڑا محدود ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اکثریت کو بغاوت میں اپنے معاملات کے حل ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ ویسے بھی بغاوت کسی نظام کو مکمل طور پر تباہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے مسائل کا

مل جاتی ہے مثلاً حکمران طبقے کے بعض بااختیار لوگ جیسے گورنر، یا امراء زیادہ مراعات کے لئے مرکز سے بغاوت کرتے ہیں یا وہ بغاوتیں ہوتی ہیں جو ٹیکسوں کی زیادتی، اقتصادی بدحالی یا حکام کے مظالم کے خلاف ہوتی ہیں۔ اکثر ان بغاوتوں کو اصلاحات کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس قسم کی بغاوتیں محدود مقاصد اور مطالبات کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ میں ایسی بغاوتیں بھی ہیں کہ جنہوں نے مکمل نظام کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا مگر وقت سے پہلے انہوں نے طاقت کا استعمال کرکے ناکامی کا سامنا کیا۔ ان بغاوتوں کو اصلاحات کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے انہیں سختی اور تشدد کے ساتھ ختم کیا گیا تاکہ اس کے اثرات زیادہ نہ پھیلنے پائیں۔ لیکن یہی وہ بغاوتیں ہوتی ہیں جو تاریخ میں اپنے اثرات چھوڑتی ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغاوتوں کی ناکامیوں کے باوجود اور اس ظلم و تشدد کے باوجود آخر انسان کیوں مکمل تبدیلی چاہتا ہے، اور کیوں وہ ایک مضبوط نظام کے خلاف اور اس کے اداروں کے خلاف بغاوت کرکے اپنی جان کی بازی لگاتا ہے؟ اور یہ سب کچھ وہ ایک شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہے اور وہ زندگی اسے دوبارہ نہیں ملے گی۔ بنیادی طور پر بغاوت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب کہ معاشرہ میں ایک نظام اور اس کے فوائد محدود ہو کر صرف حکمراں طبقوں میں مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اس وقت معاشرہ کے محروم طبقوں کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے اور وہ اس نظام کی ہر روایت، قدر، اور اس کے ہر ادارے سے مکمل انکار کر دیتے ہیں اور یہی مکمل انکار بغاوت کی بنیاد ہوتا ہے۔

البرٹ کامیو بغاوت کے پس منظر میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ بغاوت کا نتیجہ موت ہوتا ہے مگر باغی اسے آزادی کی خاطر قبول کرتا ہے، وہ پیروں پر کھڑے ہو کر مرنا قبول کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کی اندرونی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ اور دور غلامی میں اس کی شخصیت پر جو زنگ چڑھ گیا تھا بغاوت کے بعد وہ زنگ چھٹ جاتا ہے۔ بغاوت، مزاحمت اور انکار اس کی شخصیت کو جاندار بنا کر اس میں اعتماد اور یقین کو پیدا کرتی ہیں۔ وہ بغاوت کرکے حقوق کی خاطر موت کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے اپنی زندگی سے زیادہ حقوق عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان کی خاطر جان دینا گوارا کر لیتا ہے۔ اگرچہ ان حقوق کا تعلق صرف اس کی اپنی زندگی سے نہیں ہوتا ہے بلکہ دوسرے انسانوں سے بھی ہوتا ہے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں کہ جو ظالم اور استحصالی ہوتے ہیں اس لئے بغاوت محض اپنی انا کی تسکین کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس غصہ اور جذبہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ جو چیز دوسروں کے پاس ہے وہ ان کے پاس

کیوں نہیں

موجودہ زمانے میں وقت کے ساتھ ساتھ بغاوت کے اظہار کے ذریعہ بھی بدل گئے ہیں۔ اب جمہوری روایات میں یہ بغاوتیں مزدوروں کی ہڑتالوں کے ذریعہ ہوتی ہیں یا عوام انتخابات میں ووٹنگ کے ذریعہ اپنی پسند کی جماعت کو منتخب کرکے اس کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اگر آج بھی اظہار رائے کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں، اور تمام راستے مسدود کر دیئے جائیں۔ تو احتجاج کے طور پر بغاوت اچانک بھڑک اٹھتی ہے، اور پھر یہ پر تشدد اور خون ریز ہوتی ہے اور انہیں بغاوتوں کے ذریعہ محروم طبقے اپنے حقوق کی جنگ لڑتے ہیں۔

یورپی اقوام اور تاریخ کا نقطہ نظر

یورپی اقوام نے جب نوآبادیات کو قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اس عمل کو تاریخ میں اس انداز سے بیان کیا کہ ان کا نوآبادیات پر قبضہ اور ان کا استحصال بالکل جائز اور صحیح بن کر ابھرا۔ تاریخ کے اس نقطہ نظر کو نہ صرف یورپ میں تسلیم کر لیا گیا بلکہ ان ملکوں میں بھی جن کو نوآبادیات بنایا گیا تھا اور جن کا استحصال کیا گیا تھا۔

اس نقطہ نظر میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں یورپ عالمی تاریخ کا مرکز تھا اور یورپی مورخوں نے اس مرکز کو ذہن میں رکھتے ہوئے دنیا کی تاریخ کو بیان کیا۔ اس لئے ان کے نقطہ نظر سے یورپ کا معاشرہ تہذیب کے مراحل سے گزر کر ایک معیار قائم کر چکا تھا' اور ان کے معاشرے میں جو روایات و اقدار' قانون' حکومتی ادارے' اور رسوم و رواج تھے' انہی کو معیار بناتے ہوئے انہوں نے دنیا کی دوسری تہذیبوں کو جانچا اور پرکھا۔ انہوں نے یورپ کی تہذیب کے ارتقائی مدارج متعین کر لئے تھے۔ جیسے قدیم' عہد وسطی اور جدید۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہوں نے دوسری تہذیبوں کو بھی ان خانوں میں تقسیم کیا۔ ان کی اس تقسیم کے مطابق امریکہ' آسٹریلیا' اور نیوزی لینڈ کی تہذیبیں ابھی ابتدائی شکل میں تھیں۔ ہندوستان عہد وسطی میں اور دنیا کی کوئی تہذیب ترقی یافتہ شکل میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ جہاں جہاں گئے تہذیب اور تمدن کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر مقبول ہو گیا اور ان کے مقابلہ میں دوسری اقوام خود کو غیر مہذب' اور پسماندہ سمجھنے لگیں اور ان ملکوں کے دانشوروں اور مورخوں نے بھی اپنی تہذیب کی ارتقاء کے ان تاریخی مدارج کو صحیح تسلیم کر لیا' جس کے نتیجہ میں ان کے ماضی کی تمام شان و شوکت' اور شاندار عہد کو بے کار کہا جانے لگا کیونکہ قدیم دور سے مطلب یہ ہے کہ اس عہد میں وحشت و بربریت تھی۔ عہد وسطی تنگ نظری اور توہمات کا زمانہ تھا اور صرف جدید دور میں روشن خیالی و سائنسی فکر پیدا ہوئی۔ جس میں صرف یورپی تہذیب شامل ہوئی ہے۔ تاریخ کی اس تقسیم نے قدیم تہذیبوں کو ان کے زبردست کارناموں سے محروم کر دیا۔

جب اہل یورپ نے تجارت کے فروغ اور نئے ملکوں کا مال اپنے ہاں لانے کے لئے اور

اپنے مال کی منڈیاں تلاش کرنے کے لئے سمندروں میں سے نئے راستوں کی تلاش شروع کی تو اس عمل کو انہوں نے "جغرافیائی دریافتوں" کا نام دیا۔ دریافت کی اصطلاح سے یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے ان راستوں کا وجود تھا اور نہ وہ ملک موجود تھے جن تک وہ ان راستوں سے گزر کر پہنچے۔ یہاں اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ یہ راستے اور ملک پہلے سے موجود تھے اور دوسرے لوگ ان سے واقف بھی تھے' محض اہل یورپ ان راستوں اور ملکوں کے بارے میں بے خبر تھے۔ چونکہ اس سے ان کی جہالت اور بے خبری کا اظہار ہوتا تھا اس لئے یہ کہا گیا کہ یورپی ماہرین نے اپنی مہارت' تربیت اور علم و دانش کے تحت ان راستوں کو دریافت کیا۔ دریافت ہمیشہ اس چیز کی ہوتی ہے کہ جس کا پہلے سے کوئی وجود نہیں ہوتا ہے اور یہ دریافت کرنے والے کی ذہنی و تخلیقی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یورپی اقوام کے مطابق چونکہ انہوں نے ان راستوں اور ملکوں کو دریافت کیا جو کسی مدفون خزانے کی مانند تھے اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ وہ ان راستوں کے استعمال کو صرف اپنے لئے رکھیں اور دوسروں کو ان کے فوائد سے محروم رکھیں۔ اس وجہ سے سمندروں میں طاقتور بحری بیڑوں نے یورپ کے تسلط کو قائم کر دیا اور دوسری اقوام کو یہاں سے نکال باہر کیا۔ اسی طرح نئے دریافت شدہ ممالک جن میں خصوصاً" امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ شامل ہیں ان پر قبضہ جمایا' ان کے وسائل کو اپنے لئے استعمال کیا اور اگر کوئی ان کی راہ میں رکاوٹ بنا تو اس کا صفایا کر دیا۔ انہوں نے اپنے اس نظریہ کے تحت ان ملکوں کے مقامی باشندوں کو جاہل اور غیر مہذب کہہ کر ان کے قتل عام کو جائز قرار دیا اور ان ممالک پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا گیا۔

نوآبادیاتی نظام کے قیام اور سیاسی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد یورپی اقوام نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی محکوم اقوام کو مغربی تہذیب میں ضم کر دیا جائے کیونکہ جب ان کی اپنی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور ان کی تہذیبی شناخت کو مٹا دیا جائے گا تو وہ ان کے اقتدار کو تسلیم کریں گی اور ان کی حکومت ان کے لئے اجنبی اور غیر ملکی لوگوں کی حکومت نہیں رہے گی۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے نوآبادیات کے معاشروں کی تہذیبی جڑیں کاٹ کر وہاں کے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے 1835ء میں ایک انگریز سورج وسن نے لکھا کہ۔

"لوگوں پر ایک دور دراز اور نامعلوم ملک کے نظریات مسلط کر دینا' ان کے کردار کو کم تر بنانا اور ان کی توانائی کو کچلنا ہے اس کے بعد وہ اس قابل نہیں ہوں گے کہ وہ ذہنی اور فکری طور پر خود کو ممتاز کر سکیں۔"

نوآبادیات کے لوگوں کو ذہنی طور پر پسماندہ بنانے اور فکری طور پر پسماندہ رکھنے کی شعوری کوششیں کی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ بار بار کہا جاتا تھا کہ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ یہ بات نہ صرف "نودریافت ملکوں" کے لئے کہی گئی بلکہ ان ملکوں کے لئے بھی جو کہ ماضی میں تہذیب کا گہوارہ رہ چکے تھے۔ مثلاً ہندوستان کے بارے میں مشہور فلسفی ہیگل سے لے کر ماہور مورخ رکے تک یہی بات کہتے رہے کہ اس ملک کی کوئی تاریخ نہیں۔ افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے بارے میں تو یہ بات شدومد کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان ملکوں میں تاریخی عمل اس وقت سے شروع ہوا جب وہاں یورپی اقوام آئیں اور انہوں نے ان ملکوں میں جمود کو توڑ کر اسے متحرک کیا اور اس کے بعد ہی سے یہاں تاریخ کی تشکیل شروع ہوئی۔

اس نقطہ نظر کے تحت نوآبادیاتی نظام کو قائم کرنے والوں کو "معمار" کا خطاب دیا گیا جنہوں نے امپائر کی تشکیل کی۔ ان معماروں میں صرف حکمران ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ماہرین تعلیم، قانون دان اور سائنس دان بھی شامل ہوتے تھے۔

نوآبادیاتی نظام کے قائم کرنے میں یورپی اقوام کو مزاحمتی تحریکوں سے بھی سابقہ پڑا اس وجہ سے انہوں نے اقوام کو دو قسموں میں بانٹ دیا۔ دوستانہ جذبات رکھنے والی اقوام اور وحشی اقوام۔ جن قوموں نے ان کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے خلاف جدوجہد کی یا ان کی "اصلاحات" کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا وہ ان کے دشمنوں کی صف میں آگئیں اور ان کے بارے میں ان کے خیالات سخت رہے، لیکن جن اقوام نے ان کے خلاف زیادہ مزاحمت نہیں کی انہیں اطاعت شعار کہا گیا۔

یورپی اقوام کو نوآبادیاتی ملکوں میں جب مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اپنی مخالفت اور مزاحمتی تحریکوں کو خاص اصطلاحوں کے ذریعہ بیان کیا تاکہ لوگوں میں ان کے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا نہ ہوں اور وہ ان سرگرمیوں کو وحشی سرگرمیاں سمجھیں۔ اس لئے ان کے اقتدار کی مخالفت بغاوت کہلاتی تھی اور جو لوگ اس میں شامل ہوتے تھے وہ بدمعاش، تخریب کار اور وحشی کہلاتے تھے۔ ڈاکوؤں کے گروہوں کا مطلب اس آبادی سے تھا جو ہتھیار بند ہو کر دشمن سے لڑ رہی تھی۔ متعدی علاقے کی اصطلاح اس صورت میں استعمال ہوتی تھی جب کہ ایک خاص علاقے کے لوگوں میں اتحاد ہو جاتا تھا۔ امن کاری سے مراد تھی کہ حکومت کے خلاف تمام تحریکوں کو ختم کر دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب امن و امان اور تحفظ سے نہیں تھا۔

یورپی مورخوں نے نوآبادیات کی تاریخ اپنے نقطہ نظر سے لکھی۔ ان کے دور اقتدار میں

ان کی کتابیں ہمارے نصاب میں شامل رہیں اور ان کے قائم کئے ہوئے نظریات ہماری نسلوں کے ذہنوں میں راسخ ہو گئے۔ آج جب ہم ان خطوط پر اور اس سوچ کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے غلط تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخ کو نئے انداز سے وسیع بنیادوں پر تشکیل کیا جاتا تاکہ ہمارے ذہنوں میں رواداری پیدا ہوتی اور تعصب ختم ہوتے۔

آخری عہد مغلیہ اور آج کی صورت حال

تاریخ میں اکثر ایک عہد کے حالات دوسرے عہد سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ اگرچہ واقعات اور حالات ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر ان کی وجوہات و اسباب علیحدہ ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے نتائج بھی مختلف نکلتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی جو صورت حال ہے اگر ہم اس کا مقابلہ آخری عہد مغلیہ کے ہندوستان سے کریں تو دونوں میں بڑی مماثلت نظر آئے گی مگر ظاہر ہے کہ ان دونوں عہدوں کے حالات مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ لیکن اس مماثلت سے ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے حالات کا تجزیہ کریں اور کوشش کریں کہ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان جس المیے سے دو چار ہوا تھا اس سے خود کو بچا سکیں۔ تاریخ کا مطالعہ واقعات کا تجزیہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور قوموں کو شعور دیتا ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں حال کا مطالعہ کر سکیں۔

آخری عہد مغلیہ میں سیاسی ابتری اور زوال کی ابتداء اس وقت ہوئی جب مغل بادشاہت کا ادارہ کمزور ہوا اور اقتدار و طاقت اس کے ہاتھ سے نکل کر منصب داروں اور امراء میں آگئی۔ بادشاہ کی کمزوری کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطنت کے پھیلاؤ کے ساتھ جب مسائل زیادہ بڑھے تو اس کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ تمام معاملات کو دیکھ بھال کر سکے' اور فیصلے دے سکے' اس لئے اختیارات آہستہ آہستہ منصب داروں اور امراء میں منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح مغل امپیریل ازم کے زوال کے اسباب اس کے اندر سے شروع ہو گئے۔ جب سلطنت زیادہ پھیل جاتی ہے تو مرکز کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ دور دراز کے علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکے۔

مغل سلطنت کی کمزوری کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مغلوں نے دوسری اقوام کو اپنے اقتدار میں شریک نہیں کیا' اور بنگال' دکن' ہندوستان' اور سندھ جیسے دور دراز کے علاقوں میں حکومت کے اعلیٰ عہدے دار مغل دربار سے آتے تھے' ان کے خلاف مرہٹوں' جاٹوں' راجپوتوں اور سکھوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ ان بغاوتوں کے پس منظر میں ان قوموں کے

رعیت ہوں اور اوپر کے طبقوں کی خواہش تھی کہ انہیں بھی اقتدار میں شریک کیا جائے۔

مغل سلطنت کے زوال کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مغل منصب داروں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں' جس کی وجہ سے رعیت کی فلاح و بہبود پر پیسہ خرچ کرنے کے بجائے ریاست کی آمدن کا کثیر حصہ ان منصب داروں کی تنخواہوں اور مراعات میں چلا جاتا تھا۔ جب بغاوتوں' اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے آمدن کے ذرائع کم ہوئے تو حکومت زبردست مالی بحران میں مبتلا ہو گئی۔

ان حالات میں منصب داروں اور امراء نے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لئے اور اپنی جاگیروں سے زبردستی و تشدد کے ساتھ ٹیکس وصول کرنے کے لئے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو ان کی ذات سے وفادار ہوتی تھیں۔ مگر یہ امراء اپنے فوجیوں کو پابندی سے تنخواہ نہیں دیتے تھے اور ان کی آمدن کے ذرائع مال غنیمت اور لوٹ مار ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ کے مطالبہ پر ان سے کہا جاتا تھا کہ فلاں شہر یا گاؤں لوٹ لو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گیا۔ اقتدار اور ذرائع آمدنی حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگیوں کی ابتداء ہوئی' ایک امیر دوسرے پر حملہ کرتا' جس کے نتیجہ میں قتل و غارت گری اور خون ریزی عام ہو گئی۔ فوجیں جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتیں تو راستے میں کھیتوں کو پامال کرتیں' گاؤں کو لوٹتیں' اور رعایا کو تباہ و برباد کرتی جاتیں۔ شہروں کی فتح کے بعد دکانوں' مکانوں اور محلات کو لوٹا کھسوٹا جاتا' فوجی گھروں میں داخل ہو جاتے اور زیورات و ملبوسات اور نقدی زبردستی لے جاتے۔

اس صورت حال میں قانون کی بالادستی ختم ہو گئی' عدالتوں کے اختیارات باقی نہ رہے' سزاؤں کا نفاذ کرنے والا کوئی ادارہ نہیں رہا۔ طاقت ور اور مراعات یافتہ طبقے قانون سے بالاتر ہو گئے۔ بلکہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اپنی رعیت کو خود جس طرح سے چاہتے تھے سزا دیتے تھے اور ان کے خلاف کسی کو اپیل نہیں کی جا سکتی تھی' مثلاً جاگیردار اپنی رعیت کو قتل' قید' جرمانہ اور دوسری سزائیں دیتے تھے اور اس قانون کا تعلق انصاف سے نہیں تھا بلکہ یہ اسے اپنی مراعات کو باقی رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

لہٰذا ملک میں جو بدامنی کی فضا ہوئی' فوجوں نے لوٹ مار کی پالیسی کو اختیار کیا اور امراء و منصب داروں نے دولت جمع کرنا شروع کر دی' تو اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوا۔ زراعت تباہ ہوئی' صنعت و حرفت برباد ہوئی' شاہراہیں اور راستے غیر محفوظ ہو گئے اور بے روزگاری کے نتیجہ میں جگہ جگہ ٹھگوں' ڈاکوؤں اور پنڈاریوں کے گروہ پیدا ہو گئے۔

اس سے پورے ملک میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا' اس وقت کوئی طاقت اور قانون نہ تھا جو ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا۔ راستے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے تجارت متاثر ہوئی' اس کا اثر صنعت و دست کاری پر پڑا۔ مہنگائی میں اضافہ ہوا' غربت و افلاس بڑھا' اور اس کے ساتھ ہی معاشرے کی اخلاقی اقدار بھی متاثر ہو گئیں۔ مثلاً اب ہر شخص کی زندگی کا مقصد یہ ٹھہرا کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت حاصل کی جائے چاہے وہ لوٹ مار کے ذریعے سے ہو' یا رشوت سے۔ اس دولت کو گردش میں رکھنے کے بجائے وہ اسے زمین میں دفن کر دیتے تھے تاکہ یہ ان کے پاس ہی محفوظ رہے۔ دولت معاشرہ میں تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔

معاشی ضروریات نے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ملک اور قوم کے خلاف جنگ لڑیں' اور ان کی غداری کریں' چنانچہ اسی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو فوجیوں کے ملنے کی بھی شکایت نہیں رہی جو ان کی فوج میں شامل ہو کر پیسہ کی خاطر اپنے ہم وطنوں سے لڑتے تھے۔

اس سیاسی انتشار' معاشی بدحالی اور عدم تحفظ کی حالت میں لوگوں میں مایوسی' بے حسی پیدا ہوئی' اور قسمت اور تقدیر پر بھروسہ کیا جانے لگا۔ حالات کا تجزیہ کرنے اور مسائل کو حل کرنے کا ان میں شعور نہیں تھا اس لئے وہ ان تمام حالات کی ذمہ داری بادشاہ پر ڈال دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ صرف ایک شخص ان سب کا ذمہ دار ہے اور اس کی خواہش کرتے تھے کہ صاحب اقتدار' اقتدار سے محروم ہو جائے اور حکومت بدلے تو ان کے مسائل حل ہو جائیں' اس لئے جب بھی ایک بادشاہ قتل ہوتا' قید میں ڈالا جاتا' اور بادشاہت سے محروم کیا جاتا تو لوگوں میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ اس امید میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ نیا بادشاہ اور نئی حکومت ان کے لئے بہتری لے کر آئے گی۔ مگر اس پورے دور میں ایک کے بعد ایک عیاش' و لچر قسم کے شہزادے بادشاہ ہوتے رہے اور کسی نے بھی رعیت کی حالت بہتر نہیں بنائی۔ اس پورے دور میں کوئی تحریک اس قسم کی نہیں چلائی گئی کہ جس میں پورے نظام کو تبدیل کرنے کا منصوبہ ہوتا اور جس میں تمام طبقوں کو اقتدار میں شریک کرنے کا پلان ہوتا۔

یہ وہ حالات تھے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی برسراقتدار آئی اور انہوں نے آکر مغل نظام کی جگہ اپنا نیا نظام نافذ کیا' اگرچہ انگریز ایک غیر ملکی قوم تھے' ان کا نیا نظام ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے تھا' مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عام لوگوں نے اس دور میں سکون کا سانس لیا اور قانون و تحفظ کی وجہ سے ان کے مشکور ہوئے۔

لیکن تقریباً دو سو سال حکومت کرنے کے بعد جب انگریز اس برصغیر سے گئے تو ایسا محسوس ہوا کہ درمیان کا جو دور گیا تھا ان کے جاتے ہی وہ کڑی ٹوٹ گئی اور پھر تیزی سے حالات وہیں پر آ گئے کہ جہاں وہ انگریزی اقتدار سے پہلے تھے اور وہ تاریخی تسلسل دوبارہ سے قائم ہو گیا جو انگریزوں کے آنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔

کیونکہ اس وقت بھی قانون کی بالادستی ختم ہو چکی ہے' معیشت کی بنیادیں کھوکھلی ہیں' قومی و ملکی احساسات کی جگہ گروہی تعصبات ہیں' چوری ڈاکہ اور جرائم عروج پر ہیں' اور رشوت و بدعنوانی کا دور دورہ ہے اور ہم پھر ان حالات کا تجزیہ کرنے کے بجائے ان کی ذمہ داری چند افراد پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لئے اس وقت یہ اہم سوال ہے کہ آخری عہد مغلیہ میں جب حالات حد سے زیادہ بگڑے تو ایک غیر ملکی طاقت برسراقتدار آگئی اور ہم اس کے غلام بن گئے' آج پھر ہمارے معاشرے کے لئے یہ ایک چیلنج ہے کہ اس سے پہلے کہ حالات اور زیادہ بگڑیں اور ہم کسی تباہی سے دوچار ہوں ہم نے تاریخ سے جو سبق سیکھا ہے اس کی روشنی میں اس کا حل ڈھونڈیں۔

انسانی عظمت کی اہمیت

ایک انسان جب تک اپنی عظمت اور وقار کو برقرار رکھتا ہے' اس وقت تک اس میں تخلیقی صلاحیتیں اور ذہنی و فکری اپج باقی رہتی ہے اور وہ اعتماد کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور اپنے حق کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اسی لئے ایک ایسے معاشرے میں جہاں طبقاتی تقسیم گہری ہوتی ہے اور اقتدار چند ہاتھوں میں محدود ہوتا ہے وہاں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ انسانی عظمت و وقار کو کس طرح سے کچلا جائے کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ لوگوں کی قوت مزاحمت کو ختم کر کے انہیں اس قدر کمزور کر دیتے ہیں کہ ان پر حکومت کرنے میں اور انہیں اپنے زیر اقتدار رکھنے میں انہیں دشواری پیش نہیں آتی۔ مطلق العنان حکومتوں میں وہ تمام ذرائع اور طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو احساس کمتری میں مبتلا کیا جا سکے اور ان میں حکمران طبقوں کا ڈر اور خوف پیدا ہو اور وہ ان کی عظمت کے قائل ہو کر ان کی عزت و تکریم کریں۔ اس لئے بادشاہت کے دور حکومت میں اس قسم کی رسومات کی تجدید کی گئی کہ جو عوام کو انسانی عظمت سے گرا دیں۔ ان میں بادشاہ کو سجدہ کرنا' پاؤں چومنا' جھک کر آداب کرتے وقت نظریں نیچی رکھنا وغیرہ شامل تھیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق لباس' رہائش اور طرز معاشرت سے بھی ظاہر کی جاتی تھی۔ عوام حکمران طبقوں کے قیمتی لباس' عالی شان محلات' جلسے و جلوس سے متاثر ہوتے تھے۔ عظیم عمارتیں اونچی فصیلیں' بلند و بالا دروازے انہیں ہیبت زدہ کرنے کے لئے ہوتے تھے۔

جب طاقت و قوت اور دولت چند طبقوں میں سمٹ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں عوام کی اکثریت غربت' جہالت اور توہمات کا شکار ہو جاتی ہے اور عوام کی زندگی ان گنت مسائل میں جکڑ کر رہ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے ان ہی طبقوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ملازمت' انصاف کی ضرورت اور تحفظ کی تلاش۔ ان سب کے لئے عوام کو انہی کے دروازے پر جانا پڑتا ہے اور خوشامدانہ انداز میں ان سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ جس میں وہ خود کو گرا کر فدوی و خاکسار کہہ کر ان سے گڑگڑا کر درخواست کرتا ہے۔ اس کی درخواست کی منظوری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے بیٹھنے کے لئے قطار میں لے

لیا گیا ہے۔ اس پورے عمل میں ایک عام انسان اپنی عزت اور عظمت سے محروم ہو جاتا ہے اور اسے ہر مرحلے پر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس اس کی قوت مزاحمت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ زبان اور انداز تخاطب میں طبقاتی فرق کو قائم رکھا جاتا ہے اور جس طرح مخاطب ہوا جاتا ہے کہ وہ اپنے طبقاتی درجہ اور فرق کو محسوس کر سکے۔

انسان کی مزاحمت و بغاوت اور اس کی جسمانی و روحانی قوت کو کچلنے کے لئے اذیت و ایذا رسانی کے طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ آخری حربے ہوتے ہیں کہ جن کے ذریعے انسان کی عظمت کو ختم کیا جاتا ہے' کیونکہ اذیت کے سبب انسان روحانی و جسمانی طور پر پسماندہ ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت اس قدر کچل دی جاتی ہے کہ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہتا اور اسے خود اپنے سے اور اپنی زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہتا ہے۔

انسانی عظمت کو ختم کر کے مطلق العنان حکومتیں وقتی طور پر تو اپنا اقتدار قائم کر لیتی ہیں اور اپنی قوت و طاقت اور مراعات کو برقرار رکھتی ہیں مگر اس کے نتائج آگے چل کر معاشرے کے زوال اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے معاشرے میں ہر عمل حکمران طبقوں کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے اور عام لوگوں کی فلاح و بہبود کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ چاہے ادب ہو' فن ہو یا سائنس ان تمام کا مقصد ان طبقوں کے لئے تفریح مہیا کرنا اور ان کی ضروریات کی تکمیل کرنا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ پسماندہ رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں مغل معاشرے سے دی جا سکتی ہے۔ اکبر کے دربار میں فتح اللہ شیرازی ایک سائنس دان تھا' مگر اس نے جو بھی ایجادات کیں ان کا مقصد بادشاہ اور اس کے امراء کے لئے پیسے کھلانے ایجاد کرنا تھا کہ جس سے وہ لطف اندوز ہوں۔ اس نے ایسی کوئی چیز ایجاد نہیں کی کہ جس سے عام لوگوں کو فائدہ ہوتا اور جس کے نتیجے میں معاشی تبدیلیاں آتیں۔ بڑے بڑے شاعر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار قصیدوں میں کرتے رہے اور بڑے بڑے ادیب' امراء بادشاہوں کی وقت گزاری کے لئے قصے کہانیاں اور داستانیں لکھتے رہے۔ مورخ دربار کے واقعات اور حکمران کے کارنامے محفوظ کرتے رہے اور یہی حال موسیقاروں اور رقاصوں کا تھا کہ جو اپنے فن کو دربار تک محدود کئے رہتے تھے۔ اس پورے عمل میں عوام کی اکثریت جہالت اور بے خبری کے عالم میں رہی۔

اس لئے جب ان دو طبقوں میں اس قدر شدید فرق قائم ہو گیا اور عوام کو کچل کر انہیں ذہنی طور پر پسماندہ بنا دیا گیا تو ان دونوں طبقوں کے تعلقات میں کوئی ہم آہنگی اور یکجہتی باقی

نہیں رہی' چنانچہ جب مغل حکومت کو چیلنج کیا گیا تو ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ تنہا اپنی مدافعت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ تمام طبقے جن کی عزت و حرمت اور وقار کو ختم کر دیا گیا تھا انہوں نے مغل معاشرے کو بچانے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی کیونکہ انہیں اس معاشرے کا ایک حصہ نہیں سمجھا گیا تھا۔

معاشرے میں اصل عظمت اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب ایسے تمام اداروں' روایات قوانین اور رسوم و رواج کو مٹا دیا جائے جو انسانوں میں فرق کو قائم رکھتے ہیں یا جن کے ذریعے حکومتی ادارے عوام کی عظمت کو ختم کرتے ہیں اور انہیں بے وقار حقیر اور بے بس ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب عوام کو حکومت اور اقتدار میں جمہوری طریقوں سے حصہ ملے اور ان کی طاقت و قوت کو تسلیم کر کے ان کی رائے کا احترام کیا جائے۔ جب تک معاشرے میں ہر فرد کی عزت و عظمت کو قائم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک معاشرتی یکجہتی ناممکن رہے گی۔

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ یہاں نچلے طبقوں کو معاشی و سماجی طور پر اس قدر کچل دیا گیا ہے کہ ان کے لئے عزت و احترام کے جذبات مفقود ہو کر رہ گئے ہیں اور اس لئے سماجی پسماندگی نہ صرف مستحکم ہو چکی ہے۔ معاشرے سے تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں ہر جگہ اور فرد میں معاشرتی مسائل سے بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنائیت کا احساس اس وجہ سے ختم ہو گیا کہ لوگوں کو کسی عمل میں' چاہے وہ سیاسی ہو' تعلیمی ہو یا معاشی اس میں حصہ لینے نہیں دیا جاتا۔ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں طبقاتی تقسیم اس قدر گہری ہو جاتی ہے اور لوگوں کو زندگی کے عمل سے علیحدہ کر کے انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے تو ایسے معاشرے زوال کے عمل سے خود کو محفوظ نہیں کر سکتے۔

قومی ثقافت کیسے تشکیل ہوتی ہے

دنیا کی تاریخ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ کوئی قوم اور کوئی معاشرہ اپنی طویل تاریخ میں تنہا اور اکیلا نہیں رہا۔ اگرچہ جغرافیائی خصوصیت کی وجہ سے بعض اقوام کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ پہاڑوں' دریاؤں اور صحراؤں کی سمتوں میں چھپی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہیں مگر وقت کے ساتھ ہر قوم کی معاشرتی و معاشی ضروریات بڑھتی رہیں اور انہیں اس بات پر مجبور کرتی رہیں کہ وہ اپنے علاقوں کی تنگی سے نکل کر وسیع و زرخیز علاقوں میں اپنی ضروریات پوری کرنے جائیں۔ عام طور سے سرد علاقوں والے گرم علاقوں پر اور کوہستانوں و صحراؤں کے رہنے والے دریا کے آباد علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہے یا نقل مکانی کر کے وہاں آباد ہوتے رہے۔

حملہ کرنے یا نقل مکانی کرنے کے پس منظر میں قوموں اور انسانی گروہوں کی معاشی ضروریات تھیں۔ جب کوئی قوم فاتح ہو کر زرخیز میدانوں اور کھیتوں پر قبضہ کرتی تو اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مفتوح اقوام کی مزاحمت کو کچل کر انہیں غلام بنالے اور ذہنی طور پر انہیں اس قدر پسماندہ کر دے کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اس لئے فاتح اقوام اپنی روایات و اقتدار کا سہارا لے کر خود کو برتر اور اعلیٰ سمجھتیں اور مفتوح اقوام کی تہذیب و ثقافت کی ترقی روک کر اسے ختم کرنے کی کوشش کرتیں تاکہ ان کی انفرادیت اور شناخت کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کبھی ان کے رنگ کا مذاق اڑایا جاتا تو کبھی ان کی جسمانی کمزوریوں کو ظاہر کیا جاتا اور کبھی ان کی عادات و اطوار پر تنقید کی جاتی۔ سفید اقوام ہمیشہ ایشیا و افریقہ کے لوگوں کو کالا' حبشی' بدصورت اور بے ڈھنگا کہتی رہیں اور ان کی تہذیب و ثقافت کا مذاق اڑاتی رہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں آریہ اور دراوڑ نسل کے لوگوں کے تصادم میں بھی یہ چیز نمایاں رہی ہے۔

اس کے بعد فاتح اقوام مفتوحوں کو ایسے پیشے میں لگا دیتی ہیں جن کا تعلق جسمانی محنت سے ہوتا ہے اور ان پیشوں کو معاشرہ میں انتہائی ذلیل سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور وہ فاتح قوموں کے ذہنی و جسمانی طور پر غلام بن کر رہ جاتے

ہیں۔

یہ صورتحال اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک مفتوح قوم کا ذہنی شعور پست رہتا ہے۔ لیکن جب حالات کے دباؤ کے تحت ان میں شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنی شناخت کی تلاش میں مصروف ہوتے ہیں تو اس وقت انہیں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ صدیوں کی غلامی اور پسماندگی کے نتیجہ میں اپنی تاریخ زبان، رسوم و رواج اور قومی شعور کو بھلا چکے ہوتے ہیں، اس لئے دوبارہ قومی شناخت کو تشکیل دینا' ابھارنا ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے۔

قومی ثقافت کی ابتداء چھوٹے دائروں سے شروع ہوتی ہے جس کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور پھر اس میں دوسرے گروہ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے دائرے یا جماعتیں کسی ادارے یا حکومت کی جانب سے پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ ان کی تشکیل انفرادی رہنمائی کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ جب یہ چھوٹے دائرے آپس میں ملتے ہیں تو اس مفاہمت اور یگانگت کے نتیجے میں ایک قومی ثقافت ابھرتی ہے۔ بعض اوقات انہیں سیاسی و سماجی قوتوں اور طاقتوں کی جانب سے بھی مدد مل جاتی ہے جن میں بادشاہ، امراء، مذہبی جماعتیں، فوجی رہنما اور سیاسی جماعتیں وغیرہ شامل ہیں۔ قومی ثقافت کو تشکیل کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ سماج و معاشرہ کے ان تمام افراد اور گروہوں کو متحد کیا جائے جن کا لوک ورثہ ایک ہو، جو ایک تاریخی ماضی سے تعلق رکھتے ہوں۔ ثقافتی اتحاد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ کے مختلف گروپ آپس میں مل جاتے ہیں اور ان میں جو سیاسی فرقہ بندیاں اور طبقاتی تفاوت ہوتے ہیں وہ دب جاتے ہیں اور ایک قوم ہونے کا احساس تمام جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

قومی ثقافت کی تشکیل میں ادیب و شاعر سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں، قومی احساس کو ابھارنے اور قومی شعور کو پیدا کرنے کی غرض سے یہ تمام لوک گیتوں، قصوں، کہانیوں اور دیومالائی تصورات کو تحریر میں لاتے ہیں جو کہ اب تک لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تخلیقات زبان و ادب کو زرخیز کرتی ہیں۔ زبان کسی معاشرہ کی ذہنی ترقی کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس لئے جب تک زبان میں علمی و ادبی و فلسفیانہ موضوعات نہیں آئیں گے اس وقت تک معاشرہ کا ذہنی شعور بھی محدود رہے گا۔

نہ صرف شاعر و ادیب، بلکہ مذہبی علماء بھی زبان کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں اور مذہبی وعظ، تفاسیر اور مناجاتیں بھی زبان میں لکھتے ہیں تاکہ عام لوگ ان کی بات سمجھ سکیں۔

جب مقامی زبان میں ادب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی زبان کے سدھار کے لئے

قوانین و قواعد مرتب کئے جاتے ہیں اور لسانیات کے شعبہ میں ترقی ہوتی ہے۔ نئی لغات اور قواعد کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ محاوروں کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی چلتی ہے کہ زبان کو کس طرح سے غیر ملکی عناصر سے پاک کیا جائے اور اس میں خالص قومی زبان کے الفاظ و محاورے جو ماضی میں استعمال ہوتے تھے اور بعد میں متروک ہو گئے تھے انہیں دوبارہ سے استعمال کیا جائے۔

قومی زبان کو زرخیز بنانے کے لئے دوسری زبانوں کی علمی و ادبی کتابوں کے ترجمے کئے جاتے ہیں تاکہ زبان میں اتنی وسعت پیدا ہو کہ اس میں مشکل مضامین کی تشریح کی جا سکے۔ یہ قومی زبان اور اس میں لکھا ہوا ادب مختلف جماعتوں، گروہوں اور علاقوں کے لوگوں کو آپس میں متحد کرتا ہے۔

کسی ملک اور علاقے کے مختلف مذہبوں اور لوک ثقافتوں کو ملانے میں ماہر بشریات اور مورخوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ اور تحقیق کے بعد مختلف لوک ثقافتوں میں باہمی رشتے تلاش کرتے ہیں۔ ماہر بشریات مختلف قبائل اور سماجی گروہوں میں رسم و رواج اور آداب میں مماثلت دریافت کرتے ہیں اور مختلف قبیلوں میں باہمی سماجی آمیزش، تجارتی لین دین اور سیاسی تعلقات کے نتیجے میں جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ اسے اجاگر کرتے ہیں، جب کہ مورخ تاریخ کے ذریعے سماج کے مختلف طبقوں کو قریب لاتا ہے۔

انسانی معاشرے اپنے ماضی کے سلسلے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ قبائل و جماعتوں میں ہونے والا ہر وہ واقعہ جس نے انہیں متاثر کیا ہو وہ ان کی تاریخ اور ماضی کا ورثہ بن جاتا ہے اور یہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس میں برابر زبانی روایات بھی شامل ہوتی رہتی ہیں، جو اس واقعہ کی تاریخی اہمیت کو گھٹا دیتی ہیں، مگر اس میں معاشرے کی اپنی امنگیں اور جذبات شامل ہو جاتے ہیں جو انہیں خوشی و مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ قومیں اپنے ماضی کو شاندار بنانے کے لئے دیومالائی قصوں، اور تخیلاتی کہانیوں سے مدد لیتی ہیں کہ جن کا تانا بانا عظیم الشان شخصیتوں اور محیرالعقول قصوں سے بنا ہوتا ہے۔

مورخ اور ماہر بشریات یا علم الاقوام کے ماہر اپنی قوم کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ان کی صفات اور خوبیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی خصوصیت کو دوسری اقوام سے برتر ثابت کریں۔ اس تاریخی عمل سے قومی ثقافت تشکیل پذیر ہوتی ہے اور اس کی ساخت مکمل ہوتی ہے۔

امپیریلزم کیا ہے؟

امپیریلزم کی اصطلاح انگریزی زبان میں 1848ء میں استعمال ہوئی۔ اس وقت اس کا استعمال ان فتوحات کے سلسلہ میں ہوا جو فرانس نے نپولین سوم کے زمانہ میں کی تھیں۔ لیکن بعد میں اس اصطلاح میں مزید وسعت آئی' اور یہ ان فتوحات کے لئے استعمال ہونے لگی جو یورپی سلطنتوں نے سمندر پار ملکوں میں کیں تھیں۔ چونکہ یورپی اقوام نو آبادیات کی فتح کو ایک اچھے جذبہ سے تعبیر کرتی تھیں اس لئے انہوں نے امپیریلزم کو اچھے معنی دینے کی کوشش کی' اور اس تاثر کو پیدا کرنے کی کوشش کی کہ یورپی امپیریلزم دنیا کے لئے باعث نعمت ہے اور یہ غیر مہذب دنیا کو مہذب بنانے کا کام کر رہا ہے۔ مگر یورپی اقوام نے نو آبادیات میں جس جبر وتشدد اور استحصال کی پالیسی پر عمل کیا' اس نے ان کے ان دعوؤں کو بے معنی بنا دیا' اور امپیریلزم کی اصطلاح یورپی اقوام کی لوٹ کھسوٹ' دھوکہ' چال بازی اور خونریزی کے لئے استعمال ہونے لگی کہ جس کے ذریعہ انہوں نے نو آبادیات کی اقوام کو غلام بنا کر ان کے ذرائع پر کنٹرول کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکہ نے اپنی پالیسیوں کے ذریعہ امپیریلزم کا ایک اور بھیانک اور تاریک رخ پیش کیا تو امپیریلزم پسماندہ ملکوں کے لئے بھوک' غربت' مفلسی اور جہالت کا ایک اہم سبب بن گیا۔ اس لئے اردو زبان میں اس کے لئے "سامراج" کا لفظ مستعمل ہوا۔

امپیریلزم کو ہم تاریخی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیم امپیریلزم' یورپی امپیریلزم اور نیو امپیریلزم (NEO-IMPERIALISM)۔ تاریخی تسلسل اور تبدیلی میں اس کی ساخت اور ہئیت میں تبدیلی آتی رہی اور اس کے مقاصد اور مفادات بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔ لیکن ایک چیز جو ان تینوں ادوار میں مشترک رہی وہ اس کا ظلم و استحصال تھا کہ جس کے ذریعہ امن پسند' صلح جو اور سادہ عوام کو لوٹا گیا اور ان کی زندگی کو تباہ و برباد کیا گیا۔

امپیریلزم کی سادہ سی تعریف اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ایسی فتوحات جو کوئی ملک اپنی سرحدوں سے باہر وسعت کی خاطر کرے اور مفتوحہ اقوام کی مرضی کے خلاف اقتدار قائم کرے اور جس کا انحصار فوجی قوت پر ہو۔ عام طور سے سیاسی اقتدار کے علاوہ بھی طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنے زیر اثر رکھنے کے لئے اقتصادی' ثقافتی اور فنی ہتھیاروں کو استعمال کرتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

زمانہ قدیم اور عہد وسطیٰ میں طاقتور سلطنتیں اپنی سرحدوں کو وسعت دینے اور کمزور اقوام کو غلام بنانے کا عزم رکھتی تھیں' اور ان فتوحات کے لئے ہمیشہ اخلاقی جواز فراہم کرتی تھیں تاکہ معاشرہ کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کر سکیں۔ یہ فتوحات جو حکمران طبقوں کے مفادات کو پورا کرنے کی غرض سے ہوتی تھیں' ان کو چھپا کر عوام کے سامنے ان جنگوں کے اعلیٰ اخلاقی مقاصد بیان کئے جاتے تھے۔ اور ان سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس مقصد کے لئے اپنی جان' مال اور دولت سب قربان کر دیں۔ فتوحات کی ایک اہم دلیل جو دی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ان کے ذریعہ اقوام کو مہذب بنایا جائے گا' کیونکہ فطرت نے انہیں اعلیٰ اور برتر صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ وہ دوسروں پر جو ان سے کمزور اور کمتر ہیں' ان پر حکومت کریں۔ قدیم زمانہ میں اس کا اظہار چین اور روم کی سلطنتوں نے کیا تھا۔

ایک مرتبہ جب کوئی سلطنت مضبوط اور مستحکم ہو جاتی' اس کے ذرائع آمدنی بڑھ جاتے' اس کی فوج جدید ہتھیاروں سے لیس ہو جاتی تو پھر حکمران طبقوں کو مزید زمینوں کی ضرورت ہوتی اور مزید ذرائع آمدنی کی خواہش ہوتی تاکہ ان کی دولت و طاقت میں اضافہ ہو۔ ایسے موقعوں پر کمزور ہمسایوں کے خلاف جنگیں شروع کی جاتیں اور اس کی دلیلیں یہ دی جاتیں کہ:

> مرکزی حکومت کا قیام چھوٹی سلطنتوں کے لئے ضروری ہے' کیونکہ اس صورت میں وہ خانہ جنگیوں سے نجات پائیں گے' ان کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی اور رعیت سکون و اطمینان سے رہ سکے گی۔

اگسٹس کہا کرتا تھا کہ ہمارے دائرہ میں آنا ماتحتی نہیں بلکہ مراعات ہے۔ اس قسم کی دلیل چینی حکمران بھی دیا کرتے تھے جو چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے لئے مرکزی حکومت کو ایک نعمت سمجھا کرتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثال مغلوں کی حکومت ہے جس نے آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی خود مختاری ختم کر کے انہیں مغل سلطنت میں ضم کر دیا' اور اس کی دلیل یہی دی کہ ان علاقوں کی رعیت اپنے حکمرانوں کے ظلم تلے تکلیف میں تھی اور مغل شہنشاہ نے انہیں اس سے نجات دی۔

ایک طاقتور سلطنت کے استحکام کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ اسے عالمی اقتدار کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ اور یہ اقتدار جب ہی قائم ہو سکتا ہے جب کہ دشمنوں سے مسلسل جنگ کی جائے۔ اس لئے ایسی ریاست کو ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اور معاہدوں' سیاسی حربوں' سازشوں اور دوسرے ذریعوں سے اپنے اقتدار کو پھیلاتے رہنا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے جنگی اہمیت کے اڈے اور علاقے قبضے میں لا کر اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھنا چاہئے۔ محفوظ سرحدوں کی ضرورت اسے ہر جنگ اور ہر فتح کا ایک اخلاقی جواز فراہم کرتی تھی (جیسا کہ موجودہ دور میں اسرائیل کی پالیسی)

اقتدار کے پھیلنے اور وسعت دینے میں مذہب نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جو قومیں اپنے مذہب کو آفاقی سمجھتی تھیں وہ اس مشن کے ساتھ قوموں کو مغلوب کرتی تھیں کہ ان کے اس عمل سے لوگ ضلالت و گمراہی سے نکل کر نجات کی جانب آرہے ہیں۔ اس لئے فتح کے بعد ان کی خواہش ہوتی تھی کہ مفتوح لوگوں کو اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں تاکہ یہ تبدیلی مذہب کے ان پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ کرکے ان کی سیاسی قوت و طاقت کو بڑھائے۔

ایک مرتبہ جب امپیریلزم کو اخلاقی جواز مل جاتا تھا تو پھر جنگ کرنا' لوگوں کو قتل کرنا' ان کا مال و اسباب لوٹنا' ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا' عورتوں کو کنیزیں اور مردوں و بچوں کو غلام بنانا سب جائز ہو جاتا تھا۔ اسی لئے فاتح فوجیں جہاں بھی جاتیں قتل و غارت گری' خوں ریزی و لوٹ کھسوٹ کرتی چلی تھیں۔

ایسے موقع پر جب کہ کوئی سلطنت عالمی طاقت کی تشکیل کے عمل سے گزر رہی ہوتی تھی' اس وقت اس معاشرہ کے شاعر و ادیب' مورخ اور فلسفی فتوحات کی شان میں قصیدے پڑھتے' قوم کی بہادری و شجاعت و جرات مندی کے گیت گاتے اور قومی برتری کے قصے و افسانے بیان کرتے تاکہ اس ذریعہ سے عوام میں ایک جھوٹی عظمت پیدا کی جائے۔

سلطنت کا پھیلاؤ' وسعت اور فتوحات امپیریل طاقت کے لئے ہزارہا مسائل پیدا کرتی تھیں۔ نئے علاقوں کا بوجھ' دوسری طاقتوں سے حریفانہ کشمکش' اندرونی اور بیرونی مسائل کا پیدا ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے باصلاحیت افراد جو اب تک ایک جگہ رہ کر ریاست کے نظام کی دیکھ بھال کرتے تھے' وہ نئے علاقوں کی فتح کے بعد بکھر جاتے تھے اور دور دراز کے مفتوحہ ملکوں میں برائے انتظام بھیج دیئے جاتے تھے۔ اور ان کی توانائی' صلاحیت و قوت یہ سب مقامی باشندوں کو دبانے اور کچلنے میں صرف ہو جاتی تھی اور ان کا اپنا معاشرہ اندرونی طور پر اخلاقی و سیاسی اور اقتصادی کمزوریوں کا شکار ہو جاتا تھا۔

تاریخ میں ایسا بھی ہوا کہ امپیریل طاقت خود مفتوح اقوام کے ہاتھوں ثقافتی اور تہذیبی طور پر شکست کھا گئی جیسے عربوں نے ایران کو فتح کر لیا مگر ایرانیوں نے اس فتح کے ردعمل کے طور پر شعوبیت' قومیت کے جذبات کے زیر اثر عباسی انقلاب کے ذریعہ عربوں کے اقتدار کو ختم کر دیا اور عرب جلد ہی اپنی تمام توانائی کو ختم کر کے دوبارہ سے عرب کے ریگستانوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد سے اسلامی تاریخ میں عربوں کی جگہ ایرانیوں اور ترکوں نے لے لی۔ یہی کچھ منگولوں کے ساتھ ہوا جنہوں نے وسط ایشیا و ایران فتح تو کرلئے مگر تہذیبی لحاظ سے مغلوب ہو کر ان علاقوں میں ایسے ضم ہوئے کہ ان کی انفرادی شخصیت تک کا اب پتہ نہیں چلتا۔

امپیریلزم کا ایک اہم اثر یہ ہوا کہ اس نے مفتوحہ علاقوں میں قومیت کے جذبات پیدا کئے اور وہ قومی روایات و اقدار جو قدیم و فرسودہ ہو چکی تھیں انہیں غیر ملکی اقتدار کے خلاف زندہ کیا گیا اور ان کی مدد سے آزادی کی جنگیں لڑیں۔ اس کشمکش میں جس قدر امپیریل طاقت نے مفتوحہ اقوام پر سختیاں کیں' اسی قدر ان میں جذبہ حریت زیادہ پیدا ہوا۔

پندرہویں سے اٹھارویں صدی تک یورپی امپیریلزم کی تشکیل ہوئی اور برطانیہ' فرانس' ہالینڈ' پرتگال اور اسپین نے امریکہ' ہندوستان اور ایسٹ انڈیز میں اپنی نو آبادیات کو قائم کیا۔ انیسویں صدی میں روس' اٹلی' جرمنی اور امریکہ ان کی صف میں شامل ہو گئے اور جاپان جو ایشیا کی ایک طاقت بن کر ابھرا تھا اس نے بھی امپیریل طاقتوں کے کیمپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان تمام امپیریل طاقتوں نے اپنی وسعت سلطنت' فتوحات اور مال و دولت کی لوٹ مار کے لئے اخلاقی جواز تلاش کئے۔ مثلاً برطانیہ "سفید آدمی کا بوجھ" فرانس "غیر مہذب قوم کو فرانسیسی تہذیب سے روشناس کرانا" امریکہ "تقدیر ظاہر" جاپان "مشرقی ایشیا میں خوشحالی کا منصوبہ" روس "پان سلاو ازم" اور جرمنی "پان جرمن ازم" کے قائل ہے۔

اس سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ امپیریلزم کو اچھے معنی دیئے جائیں اور اس کا یہ مقصد قرار دیا گیا کہ اس کے ذریعہ یورپی اقوام وحشی و تمدن سے عاری لوگوں کو مہذب بنانے کا کام کر رہی ہیں اور امپیریلزم کے ذریعہ مغربی تہذیب' یورپی ٹیکنالوجی اور عیسائیت کی تعلیمات سے ان کو روشناس کرا رہی ہے۔ لیکن عملی طور پر امپیریلزم کے اثرات منفی تھے۔ اس نے یہ مفتوحہ اقوام میں تقسیم پیدا ہو سکی اور امپیریلزم جنگ' خوں ریزی' استحصال اور جابرانہ حاکم کی شکل میں ابھرا۔ اور اس حیثیت میں لوگوں نے اسے جانا اور پہچانا۔

1830ء کی دہائی میں ایڈورڈ ویک فیلڈ نے امپیریلزم کی حمایت کرتے ہوئے اسے برطانیہ کے لئے لازمی قرار دیا کیونکہ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زیادہ زمین کی ضرورت تھی

تاکہ زائد آبادی کو وہاں بسایا جائے۔ اس کی صنعتی پیداوار کے لئے نئی منڈیوں کو حاصل کیا جائے اور زائد سرمایہ کو سمندر پار ملکوں میں زرخیز زمینوں کی خریداری میں استعمال کیا جا سکے۔ تقریباً" یہی خیالات دوسری یورپی امپیریل طاقتوں کے تھے جو نوآبادیات کے حصول میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتی تھیں۔

اس مرحلہ پر جے۔ اے۔ ہابسن نے امپیریلزم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کے معاشی و سیاسی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے 1902ء میں "امپیریلزم۔ ایک مطالعہ" شائع کی۔ اس کتاب میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا' وہ یہ تھے کہ امپیریلزم نظام سرمایہ داری کی پیداوار ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ملک کے تاجروں اور صنعت کاروں کو نئی نئی منڈیاں مل جاتی ہیں جہاں وہ اپنی اشیاء کو آسانی کے ساتھ فروخت کرتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری اور امپیریلزم کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کے نتیجہ میں سرمایہ اور سرمایہ کاری کا منافع چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ صنعتی پیداوار کی مانگ ملکی منڈیوں میں گھٹتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے صنعت کار کو ضرورت ہوتی ہے کہ اس پیداوار کو غیر ملکی منڈیوں تک لے جائے۔ اس مقصد کے لئے نوآبادیات کی منڈیاں اس کے لئے سب سے عمدہ کھپت کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ملک میں کم تنخواہوں کی شرح' قوت خریداری کا نہ ہونا' پیداوار کی زیادتی جس میں مزید اضافہ مشینوں کی وجہ سے ہوا اس نے سرمایہ کی زیادتی کو پیدا کیا اور اس وجہ سے نئی منڈیوں کی ضرورت پڑی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امپیریلزم کا سہارا لیا گیا۔

ہابسن کے بعد امپیریلزم کے نظریہ کو لینن نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ایک نئی جہت دی۔ 1916ء میں اس نے "امپیریلزم۔ سرمایہ داری کی آخری منزل" نامی پمفلٹ لکھا' اس نے نوآبادیاتی نظام' سرمایہ داری اور امپیریلزم کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ 1860ء تک سرمایہ داری آزادانہ مقابلہ کی حمایت کرتی تھی مگر 1900ء میں یہ آزادانہ مقابلہ کی مخالف ہو گئی اور اس کی جگہ اجارہ داری آ گئی۔ لہٰذا امپیریلزم نظام سرمایہ داری میں اجارہ داری کی اسٹیج ہے۔ کیونکہ جب ٹیکنالوجی میں ترقی ہوئی تو نئی مشینی قوت نے مقابلہ کو ختم کر کے اس کی جگہ اجارہ داری کو مستحکم کیا۔ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو گئے اور ان کی جگہ بنک اور ٹرسٹ جیسے سرمایہ دار ادارے بن گئے اور تمام سرمایہ پر ان کا کنٹرول ہو گیا۔ یہاں تک کہ حکومتی ادارے بھی ان کے ماتحت ہو گئے۔

یہ بڑے بڑے سرمایہ دار ادارے اپنے منافع کو قائم رکھنے کی غرض سے سرمایہ کاری

دوسرے ملکوں میں کرنے لگے کیونکہ اپنے ملک میں سرمایہ کاری سے پیداوار کو بڑھایا جاتا تو اس صورت میں انہیں کم منافع ملتا۔ اجارہ داری کی صورت میں یہ نہ صرف ملکی منڈیوں سے فائدہ اٹھاتے بلکہ سرمایہ کی زائد مقدار کو افریقہ' ایشیا کی نوآبادیات اور کم ترقی والے ملکوں میں بھیجنے لگے۔ سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور منافع کی شرح کو بڑھانے کی غرض سے انہوں نے ان ملکوں کی حکومتوں کو اپنے زیر اقتدار کر لیا۔ لینن لکھتا ہے کہ:

"امپیریلزم ترقی کے اس مرحلہ کی سرمایہ داری ہے جس میں مالیاتی سرمایے اور اجارہ داریوں کا غلبہ مکمل ہو چکا ہو۔ سرمایہ کی برآمد واضح اہمیت اختیار کر گئی ہو' بین الاقوامی ٹرسٹوں کے درمیان دنیا کی تقسیم شروع ہو چکی ہو' عظیم سرمایہ دار طاقتیں ساری دنیا کو آپس میں بانٹ چکی ہوں۔ ان معنوں میں امپیریلزم سرمایہ داری کے ارتقاء میں ایک خاص مرحلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے لینن لکھتا ہے کہ چونکہ صرف نوآبادیات میں یہ ممکن تھا کہ اس نظام کو قائم کیا جائے۔ اس لئے خام مال اور محفوظ منڈیوں کے لئے 1870ء سے یورپ کے صنعتی ملکوں نے نوآبادیات کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اور دنیا کو تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیا۔ یہ انہیں نوآبادیات کے حصول اور منڈیوں کی ضرورت تھی کہ یورپی طاقتیں پہلی (اور دوسری) جنگ عظیم میں ایک دوسرے سے لڑ پڑیں۔

لینن نے اس امید کا اظہار کیا کہ یہ عالمی جنگیں کچلے ہوئے عوام کو سرمایہ داری کے خلاف لے جائیں گی اور اس کے نتیجہ میں سوشلزم کا عروج ہو گا۔

ہابسن اور لینن میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ہابسن امپیریلزم کو خراب نظام سرمایہ داری کی وجہ قرار دیتا ہے اور اس لئے اس میں اصلاح کی توقع رکھتا ہے لیکن لینن امپیریلزم کو سرمایہ داری کی آخری منزل قرار دیتا ہے جس میں اس کی موت پنہاں ہے۔

مورخوں نے معاشی وجوہات کے علاوہ بھی امپیریلزم کی دوسری وجوہات کو تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے اکثریت ان مورخوں کی ہے جو نظام سرمایہ داری کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر معاشی وجوہات کو امپیریلزم کی بنیاد بنا کر اس میں شامل دوسرے عناصر کا بھی مطالعہ کیا جائے تو اس کو بہتر طریقہ سے سمجھا جا سکے گا۔ لیکن اگر مورخین کی اس دلیل کو تسلیم کر لیا جائے کہ امپیریلزم "غیر حاضر دماغی کے جذبہ" کے تحت ہوا۔ اور اس کے پس منظر میں کوئی منظم اور پوشیدہ منصوبہ نہیں تھا' تو یہ دلیل بڑی مضحکہ خیز ہو گی۔ مورخین جن وجوہات کو امپیریلزم کی بنیاد قرار دیتے ہیں' ان میں تجارت' عیسائیت اور مذہب پھیلانے کا عمل' فوجی جذبہ'

قومیت، نسل پرستی، سوشل ڈارون ازم، جنگی ضروریات، قومی وقار، بڑھتی ہوئی آبادی کی منتقلی، چند افراد کا جذبہ مہم جوئی کہ جنہوں نے بغیر کسی مشورے کے موقع پر فیصلہ کرتے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر لیے۔ مقامی حکمرانوں کی سازشیں جنہوں نے یورپی اقوام کو فتوحات کے مواقع دیے، مقامی طاقت کا خلاء جسے یورپی اقوام نے پر کیا، اور مقامی "حمایتیوں" کی مدد جنہوں نے نوآبادیاتی نظام کو کامیاب بنایا۔ اس طرح امپیریلزم کے پیدا ہونے میں معاشی وجوہات کے علاوہ سیاسی، ثقافتی، سماجی، نفسیاتی اور جنگی وجوہات بھی تھیں۔

کچھ مورخین نے اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ صرف یورپی اقوام ہی نے مقامی طاقتوں کا استحصال نہیں کیا بلکہ مقامی طاقتوں نے بھی یورپیوں کو اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کیا۔ چونکہ مختلف یورپی طاقتیں آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں، اس لئے بہت سی مقامی حکومتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا۔ بعض نے ڈپلومیسی کے ذریعہ اپنی خود مختاری کو بھی برقرار رکھا۔

اس میں شک نہیں امپیریل طاقتوں کی کامیابی میں مقامی حکومتوں اور ان کے باشندوں کی کمزوریاں بھی تھیں۔ حکمران طبقوں کی بدعنوانیوں، قومیت کے فقدان اور حکومت و رعیت میں دوری نے انہیں فتوحات کے مواقع فراہم کئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی براہ راست امپیریلزم ماضی کا ایک حصہ بن گیا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں آزادی کی تحریکوں نے لوگوں میں قومیت کے جذبات پیدا کر کے ان میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی نئے آزاد ملکوں کے عوام کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ کیونکہ اب امپیریلزم ایک نئی شکل اور نئی ہیئت کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور ان ملکوں کے عوام کو غربت و افلاس اور جہالت میں رکھ رکھا ہے۔ ماضی میں امپیریلزم لوگوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے جبر، ظلم و تشدد اور استحصال کے عمل سے بخوبی واقف تھے، اس لئے ان میں ردعمل کے طور پر آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ لیکن نیا امپیریلزم نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے اور اس کا اقتدار براہ راست نہیں۔ اس لئے اس کے چھپے استحصال کو عوام دیکھ نہیں سکتے اور اس کے خلاف ان میں کوئی حس تحریک پیدا نہیں ہوتی۔

نئے امپیریلزم کی بنیاد حمایتیوں کے گروہ پر ہے۔ حمایتیوں کا یہ گروہ ان قوم پرست راہنماؤں میں سے پیدا ہوا ہے جنہوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف عوامی تحریکیں چلائیں۔ آزادی کے بعد یہ بورژوا طبقے جب اقتدار میں آئے تو انہوں نے نوآبادیات کے ان تمام

اداروں کو اسی طرح باقی رہنے دیا کہ جن کے ذریعے غیر ملکی حکومت کرتے تھے۔ عوام کو ان کے حقوق دینے کے بجائے انہوں نے آمرانہ اور جابرانہ اداروں کو قائم کیا اور اپنی مراعات اور حیثیت کو محفوظ رکھنے کی غرض سے عوام سے اپنا تعلق توڑ کر نئے امپیریلزم کے بین الاقوامی اداروں سے سمجھوتہ کر لیا۔ جس کی وجہ سے ان کے اقتدار کو حمایت مل گئی، اور ان کی حمایت سے نئے امپیریلزم کو ان ملکوں میں پہلے سے زیادہ استحکام حاصل ہو گیا۔ مالی امداد، قرضوں، ٹیکنالوجی کی منتقلی اور سماجی و ثقافتی چالوں کے ذریعے انہوں نے ان ملکوں کے اندرونی معاملات پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ چونکہ یہ نیا امپیریلزم اور اس کے ادارے عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں اس لئے ان کے خلاف کوئی شعور عوام میں نہیں اور یہی کسی تحریک کو پیدا ہونے سے روکتا ہے۔ اس لئے عوام اپنا غصہ حکومتوں پر اتارتے ہیں۔ جب ایک حکومت بدنام ہو جاتی ہے تو فوجی انقلاب یا محدود انتخابات کے ذریعے یہ دوسری حمایتی حکومت کو اقتدار دلا دیتے ہیں۔ عوام اس تبدیلی سے یہ سمجھتے ہیں شاید ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر ان کی یہ امیدیں موہوم ثابت ہوتی ہیں۔

اس لئے امپیریلزم کا خاتمہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب تیسری دنیا کے عوام میں سیاسی شعور پیدا ہو اور وہ اپنے ملکوں میں سیاسی و معاشی تبدیلی لا کر عوامی حکومت قائم کریں اور نئے امپیریلزم اور اس کے بین الاقوامی اداروں سے چھٹکارا پائیں۔

امپیریل ازم کی تعریف

امپیریل ازم کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے 1848ء میں نپولین سوم کی امپائر کے لئے استعمال ہوا تھا۔ اس کے بعد 1871ء میں جب جرمنی متحد ہوا اور اس نے جرمن امپائر کو کسٹم یونین کے ذریعے دوسرے ملکوں سے علیحدہ کر کے اس کا تحفظ کیا تو یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔ انیسویں صدی میں اس کا استعمال اس سرمایہ کاری کے لئے ہوا جو ریاست کی طاقت کے ذریعے دوسرے ملکوں میں کی جائے۔ ہابسن اور لینن نے اس اصطلاح کو وسیع کر دیا اور لینن نے اپنی کتاب "امپیریل ازم سرمایہ داری کی انتہائی اسٹیج" میں اس کی بنیاد معاشی مفادات پر رکھی۔ جس میں زائد سرمایہ کاری پس ماندہ اور غیر صنعتی ملکوں میں ریاست کی طاقت کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں صورت حال کی تبدیلی کے ساتھ اب امپیریل ازم کے ساتھ نیو امپیریل ازم کی اصطلاح کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ اب نو آبادیات نہیں رہیں کہ جن پر صنعتی ملکوں کا قبضہ تھا اور جن کی منڈیوں اور خام مال پر انہیں اختیار تھا آزادی کے بعد صورت حال بدل گئی ہے۔ اس لئے اب سرمایہ کاری ریاست کی طاقت کیساتھ نجی طور پر بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں کی جانب سے ہو رہی ہے جو منڈیوں پر قبضہ بلا واسطہ ہوتا ہے جس میں صنعتی ممالک اور بڑی فرمیں پس پردہ رہ کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں۔

امپیریل ازم کی اصطلاح میں مزید الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے اور نو آبادیاتی نظام کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ برطانوی مورخ جب اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو وہ اس سے مراد امپائر کی تشکیل سے لیتے ہیں۔ یعنی وہ عمل جس کے ذریعے برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات میں وسعت ہوئی۔ دوسرے یورپی مورخ امپیریل ازم اور نو آبادیاتی نظام کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ امریکی مورخ چاہتے ہیں کہ اسے نو آبادیات سے منسوب کر دیا جائے۔ اس تعریف کے بعد وہ امپیریل ازم کی خرابیوں سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں کیونکہ امریکہ نے یورپی اقوام کی مانند نو آبادیاتی نظام قائم نہیں کیا تھا اس لئے وہ اس نظام کی خرابیوں سے اپنا دامن پاک و صاف رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ جب نو آبادیاتی ملکوں میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو امریکہ نے ان تحریکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں

اس نے جمہوریت، حقوق خود اختیاری اور امن کے نعرے لگائے۔ امریکہ لاطینی امریکی ملکوں میں اپنے اثر و رسوخ کو معاشی امپیریل ازم کہتا رہا اور ان ملکوں میں اپنی دخل اندازی کا اس نے یہ استدلال دیا کہ اس کے ذریعے اس نے ان ملکوں کی سیاست کو مستحکم رکھا اور انہیں انقلابوں سے بچایا۔

امپیریل ازم کی خرابیوں سے بچنے کے لئے کچھ مورخوں نے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا۔ مثلاً کلچرل، کمرشل، اور سوشل امپیریل ازم وغیرہ تاکہ اس کے ذریعے اس بات کا تاثر دیا جائے کہ اس کا اثر ایک پہلو یا شعبے میں رہا اور یہ تمام خرابیوں کا ذمہ دار نہیں۔

موجودہ دور میں امپیریل ازم کی مختلف شکلوں کو مختلف اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے مثلاً "نیو امپیریل ازم" اس تعریف کے تحت کسی ملک پر سیاسی اور معاشی تسلط کو اس صورت میں برقرار رکھا جائے کہ اس میں قبضہ کی ضرورت پیش نہیں آئے اور بغیر قبضہ کے دخل اندازی کے مواقع حاصل کئے جاتے ہیں۔ "ماتحتی امپیریل ازم" کی صورت میں ملکوں کو مستقل طور پر نو آبادیات کی صورت میں رکھا جاتا ہے۔ جیسے جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ۔ "ردعمل کے طور امپیریل ازم" اس صورت میں مجبوری کی حالت میں نو آبادیات پر قبضہ کیا گیا اور اس کے پس منظر میں کوئی معاشی وجوہات نہیں تھیں۔ اس تعریف کے تحت نو آبادیات پر قبضہ کے نتیجے میں صنعتی ملکوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔

امپیریل ازم کے یہ نظریات سرمایہ دار اور صنعتی ملکوں نے پیش کئے تاکہ ان کے ذریعے وہ اپنے استحصال کو کم کر کے دکھائیں اور نو آبادیات میں انہوں نے جو لوٹ کھسوٹ کی ہے اس کا جواز پیش کر سکیں۔

اس کے برعکس ترقی پسند مورخوں نے امپیریل ازم کو ایک تاریخی عمل کی صورت میں رکھا اور اس کا تجزیہ کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ امپیریل ازم کی صورت بھی بدلتی رہی۔ جب سرمایہ داری نظام کا پھیلاؤ ہوا تو اس پھیلاؤ کے دوران مختلف مرحلوں پر مختلف سیاسی حربے استعمال کئے گئے تاکہ سرمایہ کی حفاظت ہو سکے۔ مثلاً سترہویں و اٹھارویں صدی میں تجارتی (مرکنٹائل) اور غلامی کے اداروں کے ذریعے سرمایہ کو جمع کیا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب یورپ میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں (مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی) وجود میں آئیں اور مرکزی و جزائر غرب الہند میں افریقہ سے غلاموں کو لے جایا گیا۔ انیسویں صدی میں "آزاد تجارت" کی پالیسی کو اختیار کیا گیا کیونکہ یورپی ممالک صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہو گئے تو پھر انہیں سرمایہ کی حفاظت کے لئے ریاست کے تحفظ کی ضرورت ہوئی۔

عالمی جنگ دوم کے بعد جب نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا تو امپیریل ازم اور سرمایہ داری ایک اور مرحلہ میں داخل ہو گئیں جس میں ریاست اور نجی کمپنیاں دونوں تیسری دنیا کے ممالک کے ذرائع کا بالواسطہ طور پر استحصال کر رہی ہیں۔

امپیریل ازم نے تاریخ میں صرف سرمایہ دار طبقہ کو فائدہ پہنچایا ہے اور موجودہ شکل میں بھی اس کا فائدہ اسی طبقہ کو ہو رہا ہے۔ جے۔ اے ہابسن نے اپنی کتاب امپیریل ازم ایک مطالعہ (1902ء) میں برطانوی امپیریل ازم کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے صرف اقلیت کو فائدہ پہنچا جس میں افسر شاہی، فوج اور سرمایہ دار شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے فوائد کے لئے پوری قوم کو نقصان پہنچایا۔ اقلیت نے قوم کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایسے نعروں کو اختیار کیا کہ جن کے ذریعے لوگوں کو بیوقوف بنایا جا سکے۔ ان میں قوم پرستی، ملک کا تحفظ، دفاع، اور عزت و وقار بچانے کی بات کی جاتی تھی جب کہ درحقیقت اس کے پس منظر میں ان کے مفادات ہوا کرتے تھے۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جب زائد سرمایہ کو دوسرے ملکوں میں منتقل کیا گیا تو اس کی وجہ سے ملک میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام نہیں ہوئے اور عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹا کر جارحانہ اقدامات کی جانب کر دی گئی۔ جب حالات بدلے تو پھر سرمایہ داری نظام نے اس بات کی طرف بھی توجہ دی کہ زائد سرمایہ کو اندرونی ترقیاتی منصوبوں پر بھی خرچ کیا جائے تاکہ ملکی صورتحال بہتر ہو اور عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ اس لئے بیرونی منڈیوں سے بے تحاشہ منافع کی صورت میں مزدوروں کی مراعات میں اضافہ کیا گیا۔ اس لئے، لینن اور ایم۔ این۔ رائے نے یہ استدلال دیا کہ امپیریل طاقتوں کی قوت چونکہ نوآبادیاتی نظام اور ان کی لوٹ کھسوٹ پر ہے اس لئے اگر نوآبادیات آزاد ہو جائیں تو ان کے منافع اور استحصال کی جڑیں کٹ جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی امپیریل ازم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور جب نوآبادیات کے ذرائع وہ خود استعمال کریں گے تو اس سے وہاں کے عوام میں خوشحالی آئے گی۔

لیکن صورت حال بدل گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ اقتصادی طور پر بدحال تھا تو اس وقت امریکہ کو سرمایہ کاری کے مواقع میسر آگئے اور اس نے امریکی امداد کے ذریعے پہلے یورپی اقوام کو معاشی بحران سے بچایا اور پھر ان کے ساتھ مل کر تیسری دنیا کے ملکوں کے استحصال کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان ملکوں میں ایسے منصوبوں کو فروغ دیا جائے جن کی وجہ سے وہ معاشی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ اس لئے

ان ملکوں میں ایسے منصوبے شروع کرائے جاتے ہیں جن سے ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً تیسری دنیا کے ملک اسلحہ پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کر رہے ہیں جو کسی بھی طرح ان کے عوام کے لئے فائدہ مند نہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دوسرے اداروں کے ذریعے تیسری دنیا کے ملکوں کو قرضوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا ہے کہ اب ان کی خارجہ و داخلہ اور مالی پالیسیاں سب مغربی و امریکی مفادات کے تحت بنتی ہیں، یہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر حکومتیں بدلتے رہتے ہیں اور انہوں نے ملکوں میں اپنے گماشتوں کا ایک ایسا طبقہ تیار کر لیا ہے جو ان کے مفادات کے لئے کام کرتا ہے۔

امریکی امپیریل ازم کی بنیادیں

امپیریل ازم کی اصطلاح کے معنی وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں جب کہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے اور یہ ممالک آزاد و خود مختار ہو چکے ہیں تو اس تبدیل شدہ صورت حال میں امپیریل ازم کے طریقوں میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ امپیریل ازم کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک ریاست شعور کے ساتھ اپنی فوجی طاقت و قوت استعمال کر کے اپنی قومی معیشت کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ موجودہ حالات میں اب صرف ریاست ہی اپنی طاقت کو استعمال نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اور فرمیں اس قدر طاقتور ہو چکی ہیں کہ وہ نہ صرف ریاست کی طاقت کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ خود بھی ریاست کی مدد کے بغیر دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کرتی ہیں اور اپنے معاشی مفادات کو آگے بڑھاتی ہیں۔ اس صورت حال میں یہ نام نہاد آزاد ملکوں کی حکومتوں کو رشوتیں دے کر ان کے سہارے اپنے تحفظات کو حاصل کرتی ہیں۔

پہلی اور دوسری جنگوں نے یورپی طاقتوں کو انتہائی کمزور کر دیا جس کے نتیجہ میں امریکہ کو یہ مواقع مل گئے کہ وہ ان یورپی ملکوں کی جگہ اپنا سرمایہ دنیا میں پھیلائے۔ لیکن امریکی امپیریل ازم کی بنیاد انیسویں صدی ہی میں رکھی جا چکی تھی اور آج تک اس کی پالیسی ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ان حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے گا کہ جب 1898ء میں امریکہ اور اسپین کے درمیان ہونے والی جنگ کے نتیجہ میں امریکی سرمایہ داری کے رجحانات میں تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی امریکی امپیریل ازم کا باعث بنی۔ امریکہ اور اسپین کے درمیان لاطینی امریکی مقبوضات کے سلسلہ میں ہونے والی جنگ کے نتائج کو دیکھتے ہوئے ایک امریکی اخبار ان ویسٹر نے ایک مضمون لکھا۔ جس کا عنوان تھا "جنگ کے تجارتی اور مالی فوائد"۔ مضمون نگار نے جنگ کے نتیجہ میں امریکی اقتصادیات پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "اس جنگ کی وجہ سے امریکی صنعت کو ترقی ہوئی خصوصیت سے اسلحہ ساز فیکٹریوں کو اور ان

کپڑے کی ملوں کو جنہوں نے فوجیوں کے لئے یونیفارم تیار کی تھیں۔ اس سے ان ٹھیکیداروں نے بھی فائدہ اٹھایا جنہوں نے فوج کو کھانے پینے کی چیزوں کی فراہمی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ اس جنگ نے بیروزگاری کو ختم کرنے میں حصہ لیا اور امریکی معاشرہ میں خوش حالی آئی۔ لہٰذا امریکی صنعت کی ترقی اور اس ترقی کے نتیجہ میں ہونے والی خوش حالی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جنگ کی پالیسی کو جاری رکھا جائے کیونکہ جنگ کی وجہ سے امریکہ کو نئی منڈیاں ملتی رہیں گی اور اس کی صنعت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔"

جون 1898ء میں اسی اخبار میں ایک اور مضمون شائع ہوا اس میں یہ کہا گیا کہ دنیا کے صنعتی ملکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تیار شدہ اشیاء کے لئے منڈیاں تلاش کریں اور اپنے منافع کو جو سرمایہ کی شکل میں ان کے پاس ہے اس کی دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کریں۔ یہ سرمایہ کاری اور نئی منڈیاں غیر مہذب اور وحشی اقوام میں ملیں گی۔ اس نے اس سلسلے میں چین کی مثال دی اور اس کی وضاحت کی کہ اگر چین میں سرمایہ کاری کی جائے تو اس کے نتیجہ میں کیا فوائد ہوں گے۔ مضمون نگار نے اس بات کی جانب بھی اشارہ کیا کہ جب امریکہ چین میں اپنی منڈیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا مقابلہ ان یورپی اقوام سے ہو گا جو پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ اس لئے اس مقابلے کے لئے اسے اپنی بحری و بری فوجوں کو تیار کرنا ہو گا۔

اخبار نے امریکہ کے لئے نوآبادیات کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی کیونکہ نوآبادیات نہ صرف تجارتی لحاظ سے منافع بخش ہوتی ہیں بلکہ جنگی و حربی نقطہ نظر سے بھی ان سے فائدہ ہوتا ہے۔ نوآبادی میں اقتدار قائم کرنے کے بعد جب حکومت یہاں سڑکیں، بندرگاہیں، عمارتیں تعمیر کرے گی، ٹرانسپورٹ کے نظام کو بہتر بنائے گی تو ان کاموں کے لئے سرمایہ داروں کو ٹھیکے ملیں گے۔ نوآبادی کی زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اور جب آگے چل کر یہ ملک ترقی کریں گے اور ان میں قوت خرید پیدا ہو گی تو اس وقت ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے وہاں صنعتی مال کی کھپت ہو گی۔ اس کے علاوہ نوآبادی کی انتظامیہ کے لئے اعلیٰ منتظمین اور سفارت کاروں کی ضرورت ہو گی کہ جن پر امریکی تعلیم یافتہ طبقے کا تقرر ہو سکے گا اور اس طرح سے تعلیم یافتہ طبقے کی بیروزگاری ختم ہو سکے گی۔

مضمون نگار نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ اپنے مفادات کا تحفظ زبردست فوجی قوت، مضبوط انتظامیہ اور نوآبادیات کے عوام کی آزادی پر مکمل پابندی لگا کر کر سکتا ہے۔ اس لئے جب امریکہ نے الاسکا، نیو میکسیکو اور ایری زونا کی ریاستوں کا الحاق کیا تو اخبار نے

مطالبہ کیا کہ یہاں لوگوں کو زیادہ آزادی نہ دی جائے۔

1900ء اور 1901ء میں ایک امریکی سوشلسٹ نے امریکی امپیریل ازم اور سرمایہ داری کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ پروڈکشن کی زیادتی کی وجہ سے سرمایہ داروں نے بڑے بڑے ٹرسٹ قائم کر لئے ہیں۔ تاکہ سرمایہ کی حفاظت ہو سکے اور یہ ٹرسٹ اقتصادی بحرانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی سرمایہ منجمد ہو گیا ہے اور اب اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ نئی نئی منڈیاں تلاش کی جائیں تاکہ سرمایہ حرکت میں رہے۔ ان منڈیوں کی تلاش کے لئے حکومت کی طاقت کی ضرورت ہے تاکہ اس کی حفاظت میں سرمایہ کاری کی جا سکے۔ ری پبلکن پارٹی جو سرمایہ داروں کی ترجمان ہے وہ امپیریل ازم کی حمایت کرتی ہے تاکہ زائد سرمایہ غیر ملکوں میں لگایا جا سکے۔

1900ء ہی میں ایک امریکی دانشور چارلس اے کوناٹ نے "امریکہ مشرق میں" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے امریکی سرمایہ اور اس کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے امپیریل ازم کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے دلائل کے مطابق تمام صنعتی ملکوں میں سرمایہ جمع ہو گیا ہے اور اب اس سرمایہ کی مزید کسی منافع بخش صورت میں ان ہی ملکوں میں سرمایہ کاری نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا کی تمام اقوام آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں تو سیاسی اور فوجی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ ہو اور ہر صنعتی ملک آزادی کے ساتھ اپنی منڈیاں تلاش کرے مگر چونکہ عملی طور پر یہ ناممکن ہے اس لئے منڈیوں کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ امریکہ کی اس سلسلے میں کامیابی کے امکانات اس لئے زیادہ ہیں کہ اس کے ہاں بڑے بڑے صنعتی ٹرسٹ ہیں جو دوسرے صنعتی ملکوں سے تجارتی بالادستی کے لئے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے امریکہ کے لئے امپیریل ازم کو منتخب کرنے یا پسند کرنے کا سوال نہیں بلکہ یہ اس کی ایک ضرورت ہے جس کے ذریعے اس کے زائد سرمایہ کی نکاسی ممکن ہے۔

اور امریکی اخبار "اسپرنگ فیلڈ" جو سرمایہ دار طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا اس نے سیاسی حالات کی تبدیلی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ استدلال دیا کہ اس دور میں (بیسویں صدی) نوآبادیات پر قبضہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ملکوں کو فتح کرنا ان پر حکومت کرنا اور ان سے خراج لینا یہ جاگیرداری دور میں ممکن تھا۔ اب یہ نوآبادیات ایک بوجھ ہوتی ہیں کیونکہ قبضہ کی صورت میں انتظامیہ اور دفاع پر کافی خرچ ہو جاتا ہے اس لئے اب قبضہ کرنے کے بجائے ان کو اپنے زیر اثر لا کر یہاں منڈیاں حاصل کی جائیں۔ ان منڈیوں کے حصول کے لئے جن ذرائع کی ضرورت

ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔

امپیریلسٹ طاقتیں جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہوں اور بڑی بڑی فوجیں رکھیں تاکہ ان کے ذریعہ ان کا رعب و دبدبہ قائم رہے۔ یہ سفارت کاروں کو اپنے حلقہ اثر کے ملکوں میں بھیج کر انہیں اس پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے ملکوں میں منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے قرضے طلب کریں۔ جب منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ان کے ٹھیکے حاصل کریں۔ پسماندہ ملکوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ وہ اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب ان کے ہاں سڑکوں، شاہراہوں، پلوں اور ریلوے لائنوں کا جال بچھایا جائے۔ ان منصوبوں کے لئے انہیں قرضے فراہم کریں اور اپنے ماہرین کی مدد سے ان منصوبوں کو پورا کرائیں۔ اگر ان ملکوں کو دفاع کی ضرورت ہو تو ان سے دفاعی معاہدے کئے جائیں اور قرضوں کی وصولیابی کی غرض سے ان پر فوجی دباؤ ڈالتے رہنا چاہئے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طاقتور بحری جہاز ان کے قریب سمندروں میں رہیں تاکہ انہیں اپنے عدم تحفظ کا احساس رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے منصوبے ہوتے تھے کہ جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اور اکثر ایسی ریلوے لائنیں بچھائی جاتی تھیں کہ جن کے راستے میں کوئی شہر نہیں آتے تھے یا سڑکوں کا جال اس طرح بچھایا جاتا تھا کہ صرف بڑے شہروں کے ارد گرد ہوتی تھیں اور ایسے بڑے ڈیم بنائے جاتے تھے کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

امریکی امپیریل ازم جس کی بنیاد انیسویں صدی میں ڈالی گئی تھی اب ایک طاقتور شکل اختیار کر چکا ہے۔ امریکی حکومت کی خارجہ اور دفاعی پالیسی سرمایہ داری نظام کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے ہے۔ امریکی سرمایہ کاری اب بھی ریاستی طاقت کے ذریعے ہوتی ہے مگر وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی اب امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں نجی طور پر اپنے ذرائع کو استعمال کر کے سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ان کا مفاد اس میں ہوتا ہے کہ جن ملکوں میں سرمایہ کاری کی جائے ان ملکوں میں عوام کی سیاسی آزادی کو کچل کر رکھا جائے تاکہ عوام ان کے مفادات کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں۔ اس لئے آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں ان کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ حکمران طبقوں کو مراعات دے کر اور انہیں اقتدار میں رکھنے کی ضمانت دے کر اپنا آلہ کار بنا لیں۔ اس لئے تیسری دنیا کے ملکوں میں یہ جمہوریت کے بجائے طاقتور انتظامیہ اور فوج پر بھروسہ کرتے ہیں کہ جن کے ذریعے وہ ان ملکوں میں عوام کا استحصال کر سکیں۔ اس لئے امپیریل ازم کی جڑیں صرف اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہیں جب عوام میں شعور پیدا ہو اور وہ اپنی حکومت قائم کر کے اپنے مفادات کا خود تحفظ کریں۔

نو آبادیاتی نظام اور اس کی ابتداء

والٹر روڈنی

نو آبادیاتی ملک یورپ سے آزادی کے بعد بھی کیوں غیر ترقی یافتہ رہے؟ اس سوال کا جواب تاریخ کے پس منظر اور حالیہ شواہد کی بناء پر بہ آسانی دیا جا سکتا ہے کہ ان نو آبادیات کو آزاد ہونے کے باوجود نیو کولونیل ازم کے ذریعہ ترقی سے روکا گیا اور جان بوجھ کر انہیں پسماندگی کی حالت میں رکھا گیا۔

کئی لوگ تیسری دنیا کی اصطلاح سے ناخوش ہوتے ہیں کیونکہ اس کا استعمال تحقیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب "تھرڈ ریٹ" اور "تھرڈ کلاس" سے لیا جاتا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ اصطلاح دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ان ممالک کے لئے استعمال ہوئی جو سیاسی طور پر غیر وابستگی کی پالیسی پر عمل پیرا ہوئے (سرد جنگ کے حوالے سے) اس لحاظ سے یہ اصطلاح عالمی سیاست میں "تیسری طاقت" کو ظاہر کرتی تھی اور اس کا اطلاق ایشیا و افریقہ کی بانڈونگ تحریک، غیر وابستہ ممالک اور گروپ 77 پر ہوا۔ (غیر وابستہ تحریک 'امن' ہتھیاروں کی کمی، نو آبادیاتی نظام کی مخالفت، آزادی کی تحریکوں اور ترقی کی حمایت کرتی ہے۔ گروپ 77 کو جولیس نیریرے نے "غریبوں کی ٹریڈ یونین" کے نام سے پکارا ہے)۔ بہر حال ہم تیسری دنیا کی تعریف اس طرح سے کریں گے کہ وہ ملک جنہیں غیر ترقی یافتہ ہونے کا باہمی تجربہ ہو، پہلے قدیم نو آبادیاتی نظام کے ذریعے اور اب نیو کولونیل ازم کے ذریعہ۔ اس تعریف میں بہت سے ملک آجاتے ہیں جن میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ساتھ ساتھ آئرلینڈ بھی ہے۔

انسانی تاریخ میں انسان نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ فطرت کے ذرائع کو استعمال کر کے اپنی بقا کے لئے جدوجہد کی اور آہستہ آہستہ فطری ماحول کو اس غرض سے تسخیر کیا تاکہ وہ غذا، رہائش اور اپنی دوسری ضروریات کو حاصل کرے۔ ابتداء میں ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد فن زراعت میں ترقی ہوئی جس کی وجہ سے زندگی کی ضروریات وافر مقدار میں پیدا ہوگئیں اور انسان کا معیار زندگی بڑھتا چلا گیا۔

پوری دنیا میں ابتدائی معاشرہ قبیلوں میں تقسیم تھا اور ان میں جائیداد پر مجموعی طور پر قبضہ تھا۔ سہولت کی خاطر لوگ کھیتوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے تھے اور جو بھی پیداوار ہوتی اس میں

سب برابر کے شریک ہوتے۔ اگرچہ اس معاشرہ میں اونچ نیچ کا فرق ضرور تھا، لیکن بنیادی طور پر لوگوں کا اپنی محنت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی پیداوار پر کنٹرول تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے پیداوار بڑھی، کچھ معاشروں نے خاص خاص شعبوں میں مہارت حاصل کر لی۔ زراعت کی وافر مقدار نے نہ صرف ان لوگوں کو غذا فراہم کی جو دوسرے پیشوں میں مصروف تھے بلکہ بادشاہوں اور منتظمین کو بھی ان کی بنیادی ضروریات دیں۔ اس کے بعد سے معاشرہ طبقوں اور درجوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا اور ان میں سے کچھ غلاموں کو استعمال کرنے لگے (جیسے روم)۔ اس کی وجہ سے کچھ معاشرے قبائلی نظام سے جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گئے۔ لیکن زراعت پیداوار کی بنیاد رہی۔ زمین پر معاشرہ کی ایک اقلیت کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے طاقت کے ذریعہ پیداوار کا بڑا حصہ خود ہتھیانا شروع کر دیا۔ اس معاشرہ میں کسان کا تعلق زمین سے گہرا ہو گیا، لیکن اسے صرف اس قدر ملتا تھا کہ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی محنت کا زیادہ تر حصہ جاگیردار کے حصہ میں آجاتا تھا۔

دوسری اہم تبدیلی جو یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں آئی وہ یہ تھی کہ اب اس میں شہروں کا اضافہ ہو گیا۔ جاگیردارانہ زمانہ کے تاجر اور سوداگر جو کانوں اور فیکٹریوں کی شکل میں سرمایہ رکھتے تھے طاقتور ہونا شروع ہوئے۔ مزدور جو اب تک زمین سے متعلق تھا اس نے اس سے رشتہ توڑا اور اپنی مزدوری سرمایہ دار کے ہاتھوں فروخت کرنا شروع کر دی۔

اس تمام عرصہ میں کچھ معاشروں نے زیادہ پیداوار کی اور زیادہ دولت جمع کی۔ لیکن اس دولت کو برابر کے ساتھ تقسیم نہیں کیا گیا اور یہ ان لوگوں کے حصہ میں آئی جو ذرائع پیداوار پر قابض تھے۔ ہم یہاں اس بات کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ یورپ نے کس طرح تیسری دنیا کی دولت کو لوٹا اور اس سرمایہ سے یورپ کے لوگوں کو عمومی اور حکمران طبقوں کو خصوصی فائدہ ہوا۔

تیسری دنیا کے بارے میں ایک مفروضہ یہ ہے کہ یہ ترقی پذیر اقوام ہیں، اور ان کی یہ ترقی یورپی ملکوں کے نقش قدم پر ہو رہی ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ تیسری دنیا پس ماندہ ہے اور تہذیبی طور پر ابتدائی دور میں ہے، اس لئے ابھی تک یہ غیر مہذب ہے، اسے مہذب بنانے کے لئے مغربی تہذیب کی فنی و سائنسی ایجادات کی ضرورت ہے۔ دنیا کی روایتی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ میں ہم سب ہی غیر ترقی یافتہ تھے، لیکن ان میں کچھ اقوام نے اپنی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے ترقی کی، جبکہ دوسری اس دوڑ میں پیچھے رہ گئیں۔ اس قسم کے بیانات اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام اپنے ساتھ تہذیب کی برکتیں لایا۔ حالانکہ یہ بالکل درست نہیں۔ ابتدائی عظیم سلطنتوں میں یونانی اور رومی شامل نہیں تھے کیونکہ ان سے

پہلے چین، ہندوستان، شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں عظیم الشان سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ یورپ کا عروج تو بہت بعد میں قرون وسطیٰ میں جا کر ہوا جب کہ مصر، میسوپوٹیمیا اور وادی سندھ کی تہذیبیں 2 ہزار قبل مسیح میں وجود میں آ چکی تھیں۔ یہ بڑی بڑی سلطنتیں تھیں جن کا نظام سلطنت انتہائی منظم اور ترقی یافتہ تھا کہ کاشت کاری کے ذریعہ ضرورت سے زیادہ پیدا کرتا تھا۔ اس کا نظام آبپاشی اعلیٰ سائنسی بنیادوں پر تھا اور یہ اس وقت کانوں سے معدنیات نکال رہا تھا جب کہ برطانوی جزائر اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں لوگ تیر کمان اور لکڑی کے ہتھیاروں سے شکار کر کے زندہ تھے۔

یورپ کے ممالک کا مشرقی تہذیبوں سے رابطہ اٹلی کے ذریعہ ہوا۔ تیرھویں صدی میں مارکو پولو جب چین سے واپس آیا تو اسے وہاں کی دولت اور تہذیب و تمدن پر زبردست حیرانی تھی۔ اس وقت یورپ ایشیا کے مقابلے میں اقتصادی، سائنسی، فنی مہارت اور تجارت اور دست کاری میں بہت پیچھے تھا۔ چین اور ہندوستان کو بہت کم یورپی اشیاء کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنی ضروریات میں خود کفیل تھے۔

اور یہی بات لاطینی امریکہ اور افریقہ کے لئے درست تھی۔ میکسیکو میں ایزٹک اور پیرو میں انکا دونوں ترقی یافتہ اور طبقاتی معاشرے تھے اور ان دونوں معاشروں میں دھاتوں اور پر تعیش اشیاء کا لین دین ہسپانویوں کی آمد سے قبل موجود تھا۔ ولندیزی سیاحوں نے جب افریقہ میں بینن شہر کی وسعت اور منظم دیکھی تو وہ حیران رہ گئے۔ اسی طرح جب یورپیوں نے پہلے پہل زمبابوے کے آثار دریافت کئے تو وہ اس قدر حیران ہوئے کہ انہوں نے اس نظریہ کو پھیلایا کہ یہ سفید اقوام کے تعمیر کردہ ہیں۔

ان معاشروں میں جو چیز ملتی جلتی تھی وہ ان کی زرعی پیداوار کی وافر مقدار تھی جس کی وجہ سے شہر کی آبادی خوب پھیلی اور اس کے نتیجہ میں محنت کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی اقوام کی آمد سے قبل یہ ممالک جو اب تیسری دنیا کہلاتے ہیں وافر مقدار میں غذا پیدا کرتے تھے۔ خاص طور سے ایشیا اور وسطی امریکہ کے ممالک۔

یورپی نوآبادیاتی نظام کے دو اثرات ہوئے۔ اول تو اس نے ان ملکوں کی اپنی ترقی کی رفتار کو روک دیا، ان کے سرمایہ اور ان کی زیادہ پیداوار کو ان سے چھین لیا۔ اس وجہ سے یہاں کے عوام کی صلاحیتیں متاثر ہوئیں اور ترقی کا عمل رک گیا۔ دوسرے یہ کہ دنیا کے اکثر ممالک اب عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے شکنجہ میں گرفتار ہیں جس کی وجہ سے ان کا مسلسل استحصال ہو رہا

ابتدائی نوآبادیاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ

جیری بیگ اور موزم علی

یورپ میں اسپین اور پرتگال ان اولین ملکوں میں سے تھے جنہوں نے نوآبادیاتی نظام کی ابتدا کی۔ شروع میں انہوں نے ہندوستان اور چین کی دولت مند اقوام سے تجارت شروع کی اور سلک، مسالے اور قیمتی جواہرات کو سونے و چاندی کے عوض خریدا۔ ان کی یہ تجارت شمالی افریقہ کے راستہ سے ہوتی تھی جو کہ طویل اور مہنگا تھا کیونکہ راستہ میں عرب تاجر ان کے منافع میں سے حصہ بٹاتے تھے، اس لئے ایک ایسے راستہ کی ضرورت تھی جو یورپ کو براہ راست مشرق سے ملا دے۔

پندرہویں صدی کے بعد سے پرتگیزیوں نے افریقہ کے مغربی ساحلوں سے سونا، ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت شروع کر دی۔ 1455ء میں پوپ کے ایک فرمان نے انہیں ان تمام ممالک کی تجارت کا مالک بنا دیا جو مشرق میں ان کے رابطہ میں آئے تھے۔ 1487ء میں انہوں نے راس امید کے گرد چکر لگایا اور 1499ء میں واسکوڈی گاما افریقہ کے مشرقی سواحل تک جا پہنچا تھا اور بحر ہند کو عبور کر کے ہندوستان، ایران اور عرب کے سواحل سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ اور آگے بڑھے اور ملایا، فلپائن اور انڈونیشیا تک چلے گئے اور ان ملکوں میں مسالوں کی تجارت پر انہوں نے کنٹرول کر لیا۔ پرتگیزی اور آگے بڑھتے مگر چین اور جاپان کی طاقتوں نے انہیں مزید نہیں بڑھنے دیا۔

اسی دوران میں ہسپانوی جو پرتگیزیوں کی وجہ سے افریقہ میں اپنے قدم نہیں جما سکے تھے اور جنہیں پوپ کے فرمان نے ایشیا و افریقہ کے استحصال سے روک دیا تھا اور یہ حق صرف پرتگیزیوں کو دیا تھا، انہوں نے اپنی توجہ مغرب کی جانب مرکوز کی تاکہ وہاں مسالہ جات کی تجارت پر قابض ہو سکیں۔ 1492ء میں کولمبس راستوں کی تلاش میں روانہ ہوا اور کریبین جزائر پہنچ گیا اور انہیں "جزائر غرب الہند" کا نام دیا۔ دوسرے سفر میں وہ اپنے ساتھ ایک ہزار دو سو آباد کاروں کو ہسپانیولا (جو اب ہیٹی اور ڈومینیکن ریپبلک کہلاتے ہیں) لے آیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے سونا حاصل کیا جائے اور ان علاقوں میں گنے کی کاشت کی جائے۔

بعد سے ہسپانوی کریبین جزائر میں آباد ہونے کے لئے آتے چلے گئے اور بڑھتے بڑھتے یہ امریکہ کی سرزمین پر پہنچ گئے۔

کریبین جزائر سے وہ بہت کم دولت حاصل کر سکے۔ یہ ان کے لئے مایوسی کا باعث ہوئی۔ اس کمی کو امریکہ کی سرزمین نے پوری کر دی (خصوصیت سے جنوبی اور وسطی امریکہ نے) اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی کہ انہوں نے ایشیا میں تجارت کی غرض سے پرتگیزیوں سے لڑائی ختم کر دی۔ ہسپانویوں اور پرتگیزیوں کی اجارہ داری کو پوپ کے 1493ء کے فرمان نے تقدس کا درجہ دے دیا۔ 1494ء میں تورڈے سی لاس کے معاہدے نے پرتگال کو برازیل کی نامعلوم سرزمین کے حقوق دے دیئے۔ 1521ء میں میگلان نے دنیا کا چکر لگایا اور فلپائن کے جزائر پر اسپین کے حق کا اعلان کر دیا۔

نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ہی غلاموں کی تجارت کی ابتداء ہوئی۔ اس سلسلے میں والٹر روڈنی نے لکھا ہے کہ "جس عمل سے افریقہ کی سرزمین سے غلاموں کو حاصل کیا گیا یہ تجارت نہیں تھی بلکہ یہ جنگ، دھوکہ، ڈاکہ اور اغوا کی وارداتیں تھیں۔"

اس تجارت کے اثر سے افریقہ پر جو کن اثرات ہوئے۔ تقریباً تمام افریقہ کے علاقوں سے غلام حاصل کئے گئے اور تندرست و توانا مردوں اور عورتوں کو زبردستی غلام بنا کر اور آبادی کو جوڑ کر بر اعظم کو غیر ترقی یافتہ کر دیا۔ آبادی کے ایک بڑے حصہ کو غلام بنانے سے تجارت و کاشت کاری متاثر ہوئی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عمل نے افریقہ کی آبادی کو محدود کر دیا، یہ وہ وقت تھا جب کہ انسانی آبادی کی توانائی پیداوار کو بڑھانے کے لئے ضروری تھی۔

آبادی کی شرح

سال	1650	1750	1850	1900
افریقہ	100	100	100	100
ایشیا	103	144	274	423
یورپ	257	437	656	857

اگر برطانیہ یا یورپ کے کسی ملک کے باشندوں کو غلام بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا اور ان کی محنت و مزدوری سے دوسرے فائدہ اٹھاتے تو ان ملکوں کے لئے ترقی کرنا ناممکن ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ افریقہ کی ترقی اس عمل نے روک دی اور اسے آگے چل کر بھی نقصان پہنچایا۔

غلاموں کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی کی جاتی تھی جس میں مارنا، اذیت دینا اور جسم کے مختلف حصوں کو جلانا شامل تھا۔ ان میں سے بہت سوں نے ردعمل کے طور پر بغاوتیں بھی کیں، اپنے مالکوں پر حملے بھی کئے اور فصلوں کو آگ بھی لگائی۔ جب برطانیہ اور فرانسیسیوں نے کریبین کے جزائر کو نوآبادیات بنایا اور یہاں یورپ کی ضروریات پیدا کرنے کے لئے شکر، کافی اور روئی کی کاشت شروع کی تو اس مقصد کے لئے غلاموں کی محنت و مزدوری کو استعمال کیا گیا۔ اس پالیسی کے خلاف ردعمل بھی ہوا اور جمیکا کے پہاڑوں میں حبشیوں نے اپنا آزاد معاشرہ قائم کر لیا۔ اور اہل برطانیہ کو گوریلا جنگ میں شکست دے دی۔

ہائٹی میں ایک غلام توسین لا اورتر نے غلاموں کی بغاوت کی سربراہی کی اور فرانس سے لڑ کر 1804ء میں آزاد جمہوریہ قائم کی۔ غلامی ختم ہونے سے قبل تقریباً 41 بڑی غلاموں کی بغاوتیں ہوئیں۔

ہندوستان میں اہل برطانیہ نے بنگال سے لوٹ کھسوٹ کی ابتداء کی۔ یہ ہندوستان میں ٹیکسٹائل صنعت کا مرکز تھا اور یہاں سے مختلف اشیاء درآمد کی جاتی تھیں۔ 1857ء میں کلائیو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے ذریعہ یہاں مسلمان حکمرانوں کو شکست دی، اس کے بعد یہاں جولاہوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کمپنی کے ہاتھ اپنا کپڑا کم قیمت پر فروخت کریں۔ وہی کپڑا بعد میں مہنگے داموں یورپ میں بیچا جاتا تھا۔ اس لوٹ کے نتیجہ میں کمپنی نے بنگال کے خزانے کو خالی کر دیا اور صوبہ کے تمام ذرائع کو نچوڑ لیا۔ انہوں نے تجارتی اشیاء پر ان ڈیوٹیوں کے دینے سے بھی انکار کر دیا جو کہ ہندوستانی تاجر دیا کرتے تھے۔ کاشت کاری پر نئے ٹیکس لگائے گئے جس کی وجہ سے کسان غریب ہو گئے۔ جواہر لال نہرو نے اس صورت حال پر لکھا ہے کہ:

> "سیاسی عدم تحفظ اور مشکلات، بارش کی کمی اور برطانوی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی، ان سب نے مل کر 1770ء میں بنگال و بہار میں بھیانک قحط کو پیدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں سے تین فیصد سے زیادہ آبادی ختم ہو گئی۔ ان میں سے ہزاروں بھوک اور فاقہ سے آہستہ آہستہ موت کا شکار ہوئے۔ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور ان کی جگہ جنگل پیدا ہو گئے جنہوں نے کاشت کے علاقوں اور گاؤں کو نگل لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس طاقت اور پیسہ دونوں تھے کہ جن کی مدد سے وہ ان بھوکے لوگوں کی مدد کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ تو اپنی ذمہ داری کا احساس کیا اور نہ ہی لوگوں کی مدد کی کوئی خواہش کی۔ ان کا کام صرف دولت جمع کرنا

اور مالیہ اکٹھا کرتا تھا اور یہ کام انہوں نے بڑی محنت سے کیا کہ اس بھیانک قحط کے باوجود انہوں نے بچنے والوں سے پورا پورا مالیہ وصول کیا' بلکہ زیادہ ہی جمع کیا۔ اور جیسا کہ سرکاری کاغذات سے پتہ چلتا ہے یہ انہوں نے سختی کے ساتھ کیا۔"

اٹھارہویں صدی میں "اسپین کی تخت نشینی کی جنگ" کے نتیجہ میں انگریزوں' فرانسیسیوں اور ولندیزیوں نے مشترکہ کوشش کے ذریعہ ہسپانوی سلطنت کو ختم کر دیا۔ فرانس نے تو یہ کوشش کی کہ وہ تمام سلطنت کو شاہی وراثت کے قانون کے ذریعہ ہتھیا لے' جب کہ انگریزوں اور ولندیزیوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس میں اسپین اور فرانس کو شکست ہوئی اور اٹریخت (UTRECHT) کے معاہدہ کے تحت انہوں نے اپنا وسیع علاقہ انگریزوں کو دیدیا۔ اسی معاہدہ کے تحت انہوں نے شمالی امریکہ کا فرانسیسی حصہ اور غلاموں کی تجارت پر 30 سالہ اجارہ داری حاصل کر لی۔ اس کے بعد فرانسیسی ہندوستان میں پیچھے ہٹ گئے جہاں بھی اہل برطانیہ نے انہیں شکست دی۔

اسپین نے ایزٹیک' انکا اور مایا تہذیبوں کو باقاعدگی کے ساتھ تباہ و برباد کیا اور ان کی دولت کو لوٹ کھسوٹ کے انہیں محو کر دیا۔ کورٹے کی سربراہی میں فاتحین نے ایزٹیک تہذیب کے سونے کے بنے ہوئے خوبصورت مثالی کے کاموں کو پگھلا کر انہیں سونے کے ڈلوں میں تبدیل کر لیا۔ انہوں نے زرد رنگ لوگوں سے سونے اور چاندی کی بنی ہوئی چیزوں کو چھینا۔ پیرو اور نیو اسپین کی کانوں سے حاصل کیا گیا خزانہ سونا اور چاندی امریکہ سے یورپ منتقل کیا گیا۔ اس کو حاصل کرنے میں امریکہ کے مقامی باشندوں سے جبری محنت و مزدوری لی گئی' یہاں کی آبادی کو مجبور کر کے چاندی کی کانوں میں کام کرایا گیا۔ ان میں سے اکثر نے کام سے انکار کیا اور اکثر ظلم کی سختی سے مر گئے۔ آبادی کی اکثریت یورپی بیماریوں کی وجہ سے' جن کی ان میں مزاحمت نہیں تھی جیسے خسرہ اور چیچک' موت کا شکار ہوئے۔ اور اس کے نتیجہ میں علاقہ کے علاقہ بنجر ہو گئے۔ ایزٹیک' انکا اور مایا آبادی دس ملین سے گھٹ کر ایک سو پچاس سال میں صرف آدھی ملین رہ گئی۔ زمینوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر جراثیم پھیلائے گئے۔ کریبس (CRIBS) اور اراواک (ARAWAKS) جو کریبین کے رہنے والے تھے' ان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہی کچھ پرتگیزی ہندوستان میں کر رہے تھے' باشندوں کا قتل عام اور انہیں اذیتیں دینا ان کے مشاغل تھے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کی آبادی اس قدر گھٹ گئی کہ انہیں محنت و مزدوری کیلئے دوسرے ذرائع تلاش کرنا پڑے اور اس مقصد کے لئے افریقہ کو منتخب کیا گیا جہاں سے

سے غلاموں کو برآمد کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

پندرہویں صدی میں افریقی غلاموں کی تجارت شروع ہوئی اور پرتگیزیوں اور ہسپانویوں نے اسے کریبین تک پھیلایا اور وہاں سے اسے امریکہ لائے۔ اگرچہ پرتگیزیوں نے 1690ء تک برازیل میں سونا دریافت نہیں کیا تھا' مگر انہیں گنے کی کاشت کے لئے غلاموں کی ضرورت تھی۔ کاشتکاری کے روایتی طریقے میں زمین پر زیادہ بوجھ ڈالا' اس کی مثال برازیل کا شمال مشرقی علاقہ ہے۔ جو بہت زرخیز ہوا کرتا تھا' اس کے گھنے جنگل' معدنیات اور اس کی مٹی کاشت کے لئے بہت اچھی تھی لیکن پرتگیزیوں نے جلد ہی اس علاقہ کو بنجر کر دیا اور یہ علاقہ پتھریلی اور خشک گھاس والی زمین میں تبدیل ہو گیا۔ یہی حال دوسرے علاقوں میں ہوا جو ان کے قبضہ میں آ گئے تھے۔

برطانیہ' فرانس اور ہالینڈ نے سفید دہشت گردی کا دوسرا مرحلہ اس وقت شروع کیا' جب سولہویں صدی کے آخر میں برطانیہ اور ہالینڈ نے اپنی بحری طاقت کو بڑھایا اور زوال پذیر اسپین اور پرتگال کی سلطنتوں میں سے اپنے لئے علاقے حاصل کرنا شروع کئے۔ ولندیزیوں نے پرتگیزیوں سے ایشیا کی تجارت کو چھین لیا اور ان کی افریقہ سے سونے' ہاتھی دانت اور غلاموں کی اجارہ داری ختم کر دی۔ انگریزی بحری قزاق رالے اور ڈریک جن کی ملکہ الزبتھ اول نے سرپرستی کی تھی' انہوں نے اسپین کے جہازوں پر حملے کرنا شروع کئے جو امریکہ سے سونا لوٹ مار کے بعد لے جایا کرتے تھے۔ سترہویں صدی میں انگلینڈ اور فرانس نے شمالی امریکہ کی مین لینڈ پر قبضہ کی طرف توجہ دی' جہاں ہسپانوی آباد نہیں ہوئے تھے۔ یہ نئے آباد کار مغرب کی طرف بڑھتے چلے گئے اور مقامی باشندوں کو پیچھے دھکیلتے گئے۔ ان دونوں قوموں نے انہیں اپنی جنگوں میں استعمال کیا۔ اس مرتبہ بھی قتل عام ایک سوچی ہوئی سکیم کے تحت عمل میں آیا۔ انگلینڈ کے بادشاہ جارج سوم کے اعلان کے مطابق:-

"ہر مرد ریڈ انڈین کے قتل کی شہادت پر اس کی کھوپڑی لانے والے کو چالیس پاؤنڈ ۔۔۔ اور ہر ریڈ انڈین عورت اور بارہ سال سے کم عمر کی کھوپڑی لانے والے کو بیس پاؤنڈ ملیں گے۔"

آج ہزارہا فلموں میں امریکہ کے مقامی باشندوں کے قتل عام کو بڑے فخر سے دکھایا جاتا ہے اور کسی شرم اور پشیمانی کے بغیر ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ امریکہ کے مقامی باشندوں کو حقارت سے ریڈ انڈین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

جیسے جیسے یورپی آباد کار امریکہ میں بڑھتے گئے ایسے ایسے تمباکو' چاول اور نیل کی کاشت

کیلئے افریقی غلاموں کی ضرورت بڑھتی گئی۔ آگے چل کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوب میں روئی کی کاشت نے غلاموں کی ضرورت کو اور بڑھا دیا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یورپیوں نے افریقیوں کو اٹلانٹک کے پار غلام بنا کر پہنچانا شروع کر دیا۔ ان تجارتی سرگرمیوں نے یورپیوں کو تین طرح سے فائدہ پہنچایا "غلاموں کو امریکہ میں فروخت کرنا اور پھر یہاں سے خام مال کے ساتھ واپس یورپ جانا جن میں شکر اور روئی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ افریقہ میں یورپ کی تیار شدہ اشیاء فروخت کرنا اور رم کی بوتلیں اور بندوقیں ان افریقیوں کو دینا جو ان کا ساتھ دیتے تھے۔

غلاموں کی اس تجارت میں وہ افریقی غلام جو زندہ امریکہ پہنچے ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ایک سو ملین تھی جب کہ کئی ملین قید کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے یا جہازوں میں بیماریوں سے مر گئے۔

اٹھارویں صدی میں امریکہ میں برطانیہ کے خلاف بغاوت پھیل گئی اور 1783ء میں شمالی امریکہ کی نوآبادیات نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نام سے ایک آزاد مملکت بنا لی۔ کچھ عرصہ بعد لاطینی امریکہ بھی اسپین سے آزاد ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یہاں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔

سفید آباد کار آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی گئے جہاں انہوں نے مقامی باشندوں سے جنگیں لڑیں تاکہ انہیں دھکیل کر ان کی زمینوں پر قابض ہوں۔ امریکہ کے مقامی باشندوں کی طرح ان کی جدوجہد بھی آج تک جاری ہے۔

اہل برطانیہ پہلے صنعتی انقلاب کے بعد امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ہندوستان، انڈونیشیا اور جنوبی امریکہ میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور یہاں سے بڑی تعداد میں دولت کی لوٹ کھسوٹ کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ غلاموں کی تجارت، انکا اور ایزٹک تہذیبوں کی لوٹ، جنوبی اور وسطی امریکہ کی کانوں میں جبری مزدوری، بنگال میں ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا اور ذرائع پیداوار طاقت کے ذریعہ حاصل کئے گئے اور نوآبادیات کو ان میں سے بہت کم دیا گیا۔ اس وجہ سے نوآبادیات ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئیں اور یورپ کے لئے یہ دولت صنعتی ترقی میں مددگار ثابت ہوئی۔ تقریباً 23 ہزار ٹن چاندی امریکہ سے اسپین لائی گئی۔ چونکہ چاندی اس وقت ایک معیاری دھات تھی اس وجہ سے اس سے افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مشہور ماہر معاشیات کینز (KEYNES) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"بڑھتی قیمتیں اور کم تنخواہ کا مطلب زیادہ منافع ہے۔ زیادہ منافع سے زیادہ

بچت ہوتی ہے اور پیسہ کو سرمایہ لگانے کی خواہش ہوتی ہے۔۔۔ اسی امریکہ کی دولت نے یورپی سرمایہ داری کو پیدا کرنے اور فروغ دینے میں مدد کی۔"

لیکن صرف چاندی ہی وہ چیز نہیں تھی جو یورپ لائی گئی ہو۔ ارنسٹ مینڈل نے اندازہ لگایا ہے کہ اس تمام لوٹ کھسوٹ کے نتیجہ میں ایک ہزار ملین پاؤنڈ کی قیمت کی اشیاء یورپ لائی گئیں۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وجہ سے یورپی صنعتی انقلاب آیا مگر اس دولت نے اس کی مالی مدد ضرور کی، اور اس کے نتیجہ میں یورپی صنعتی سرمایہ کی ضرورت نے دنیا کے دوسرے ملکوں کو اپنا محکوم بنا لیا۔

امپیریلزم کا عہد

ٹیکنیک

1760ء اور 1840ء کے بعد برطانوی صنعتی انقلاب نے ابھرتے ہوئے صنعتی سرمایہ داری کے نظام کے ذریعہ نوآبادیاتی نظام کو پیدا کرنے میں مدد دی۔ اس دور کی صنعتی ایجادات بہت اہم ہیں جنہوں نے صنعتی عمل کو آگے بڑھایا۔ 1764ء میں ہارگریوز (HARGREAVES) نے اسپننگ جینی (SPINNING JENNEY) واٹس نے بھاپ کا انجن (1779ء) آرک رائٹ (ART WRIGHT) نے واٹر فریم (1769ء) کرومپٹن نے میول (MULE) (1779ء) اور کارٹ رائٹ (CORT WRIGHT) نے پاور لوم (1785ء) ایجاد کئے۔

ولیم کنگھم لکھتا ہے:

> "ایجادات اور دریافتیں اکثر اتفاقیہ اور حادثاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں مشینوں کی ایجادات صنعتی ضروریات کے نتیجہ میں ہو گئیں۔ یہ کہنا کہ کارٹ رائٹ اور واٹس اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ حالات ان کے موافق تھے یہ کہہ کر ان کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

محض ایجاد ہی بڑی چیز اہم نہیں ہوتی' بلکہ اہم یہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے استعمال کو فروغ دینے کے لئے اس میں سرمایہ لگایا جائے کیونکہ جب تک یہ نہیں ہو گا ایجادات بے عمل رہیں گی اور اسی لئے بہت سی ایجادات صدیوں تک بیکار پڑی رہیں اور ان کو استعمال میں نہیں لایا گیا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا' ابتدائی دور میں یورپی اقوام کی لوٹ کھسوٹ نے سرمایہ کو حاصل کرنے کے مواقع دیئے' بعد میں اس سرمایہ کو ایجادات کی ترقی اور فروغ میں استعمال کیا گیا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو واٹس کے انجن میں غلاموں کی تجارت کا منافع شامل تھا۔

جس صنعت میں سب سے زیادہ انقلابی تبدیلی آئی وہ ٹیکسٹائل کی صنعت تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ میں کپڑا تیار ہونے لگا تھا مگر اس کے مقابلہ میں مشرق کا بنا ہوا کپڑا زیادہ سستا اور اچھا ہوا کرتا تھا اور اس کی کپڑے کی صنعت مشرق سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس لئے برطانیہ کو اپنی صنعت کو زندہ رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ ایچ ایچ ولسن کے بیان کے مطابق

> "ہندوستان کا کپڑا برطانیہ کی منڈیوں میں 50 سے 60 فیصد تک برطانیہ کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابلہ میں منافع کے ساتھ بیچا جاتا تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہاں کپڑے کی صنعت کو بچانے کے لئے ہندوستان کے کپڑے پر 70 سے 80 فیصد تک ڈیوٹی لگا دی جائے اور کچھ حالات میں اسے بالکل ممنوع کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پیسلے (PAISLEY) اور مانچسٹر کی ملیں شروع ہوتے ہی بند ہو جاتیں۔"

اس کا اثر ہندوستان کے معاشرہ پر تباہ کن ہوا۔ اس پالیسی کے تحت نوآبادیات میں سے ایسی تمام صنعتوں کو ختم کر دیا گیا جو ان کی صنعتوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ جیسے آئرلینڈ والے چاہتے تھے کہ اون کا کپڑا بنائیں تو ان کی اس کوشش کو ایک برطانوی قانون کے ذریعہ روک دیا گیا۔ اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے کہ تیسری دنیا کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غیر صنعتی بنایا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ جب یہ صنعتیں مستحکم ہو گئیں تو پھر ان کے تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جب پیداوار زیادہ ہوئی تو اشیاء کی تیاری پر کم لاگت آنے لگی۔ اس وجہ سے وہ مصنوعات ختم ہو گئیں جو ہاتھوں سے تیار کی جاتی تھیں۔ اس موقع پر آزادانہ تجارت کی تبلیغ کی گئی کیونکہ زیادہ اشیاء کی پیداوار کے بعد نئی منڈیوں کی ضرورت انتہائی لازمی ہو گئی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا کہ آزادانہ تجارت دنیا کی منڈیوں کو وسعت دے گی اور اس کی وجہ سے خاص خاص صنعتوں کو فروغ ملے گا اور پیداوار میں مجموعی طور پر اضافہ ہو گا۔ ہر ملک وہ پیدا کر سکے گا جو اس کے ذرائع کے مطابق ہو گا۔ اس نظریہ کے تحت پالیسی یہ تھی کہ خام مال نوآبادیات سے لیا جائے اور یورپ سے تیار شدہ مال برآمد کیا جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان کے کپڑے کی صنعت تباہ کر دی گئی تاکہ وہ یورپی صنعت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس وجہ سے یورپ کو ایک نئی اور بڑی منڈی حاصل ہو گئی۔ افریقہ کی کپڑے کی صنعت کو پہلے ہی یورپ والے ہندوستانی کپڑے کی درآمد کے ذریعے ختم کر چکے تھے۔ بعد میں اس کی جگہ بھی برطانیہ کی صنعت نے لے لی۔

یورپ کے صنعتی انقلاب نے دستکاری اور کاریگری کے فن کو تباہ کر دیا۔ مشینوں کے ذریعہ مال تیار ہونے کے بعد' ان کے مال کی کھپت نہیں رہی اور یہ لوگ بے روزگار ہو گئے۔

یورپ میں تو یہ لوگ فیکٹریوں میں کام کرنے لگے اگرچہ کام کرنے کا ماحول سخت گندا اور غلیظ تھا لیکن نو آبادیات کے معاشرہ میں ان ہنرمندوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ یورپ کو ان نو آبادیات سے صرف خام مال اور غذائی اشیاء کی ضرورت تھی اس لئے وہاں کاریگر مجبور ہوتے کہ دوبارہ سے کاشت کاری کریں۔ جب کہ برطانیہ میں انیسویں صدی کے درمیان لوگ کاشت سے زیادہ فیکٹریوں میں کام کر رہے تھے لیکن ہندوستان اور برازیل میں لوگوں کی اکثریت کاشت کاری میں مصروف تھی اور یہ تناسب آج تک اسی طرح سے قائم ہے (1970ء کے اعداد و شمار کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کی صنعتی پیداوار میں تیسرے حصہ کا مالک ہے۔ یورپی طاقتیں اگرچہ اب تک صنعتی طور پر طاقت ور ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ کمزور ہو رہی ہیں۔ تیسری دنیا صرف 16 فیصد صنعتی پیداوار کی مالک ہے۔ تیسری دنیا کی صنعتی ترقی کے لئے وہ سازوسامان نہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے لئے تھیں۔

صنعتوں کے لئے جن اشیاء کی ضرورت تھی جیسے ربڑ، روئی، سیسل (SISAL) اور معدنیات ان کی ترقی اور فروغ کے لئے کوششیں ہوئیں اور تقریباً تمام نو آبادیات کاشت کاری اور کانوں میں تبدیل کر دی گئیں، اور ان کو اس قسم کے مواقع نہیں دیئے گئے کہ وہ اپنی صنعتوں کو آگے بڑھائیں اور تجارتی طور پر آزاد ہوں۔ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ خاص خاص چیزوں کی کاشت کریں جیسے لنکا میں کوکو، کافی، چائے اور ربڑ کی کاشت کرائی گئی۔ ایک ہی قسم کی فصل کی کاشت نے کاشت کاری اور زمین کی طاقت کو متاثر کیا۔ اس کے بعد ان فصلوں کی پیداوار کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے منتقل کیا گیا مثلاً برازیل سے ربڑ سیلون لایا گیا اور یہاں سے جاوا اور ملایا لے جایا گیا۔ کیلا انڈونیشیا سے افریقہ اور وسطی امریکہ میں لایا گیا۔ ان میں سے بہت سی فصلوں کو لندن کے کیو گارڈن کے اندر تجربہ کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا۔

نو آبادیات میں اس قسم کے ٹیکس لگائے گئے کہ کسانوں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ صرف "کیش کروپ" کو اپنی زمینوں پر کاشت کریں۔ دوسری فصلوں کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ انہیں کم زرخیز زمینوں اور بنجر علاقوں میں کاشت کرایا گیا۔ زمین کو اس بری طرح کاشت کاری کے لئے استعمال کیا کہ اس کی پیداواری قوت ختم ہو گئی اور اس نے آخرکار تیسری دنیا کے ملکوں میں قحط کو جنم دیا۔

یورپ کو چین کی منڈیوں کی ضرورت تھی اور یہ وہ صرف طاقت کے ذریعہ حاصل کر سکتا تھا۔ چین کو اس وقت تک یورپ کی کسی چیز کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ضروریات کے لئے

ہر چیز پیدا کر لیتا تھا۔ برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی جو چین کی چائے میں دلچسپی رکھتی تھی اس نے دخل اندازی کے مواقع تلاش کرنا شروع کر دیئے اور اس نے ہندوستان میں تیار کی ہوئی افیون کی کھپت کے لئے ناجائز طریقے استعمال کئے۔ ایک مرتبہ جب منشیات کی یہ تجارت چین میں قائم ہو گئی تو پھر یورپ کو وہاں دوسری اشیاء فروخت کرنے کے راستے مل گئے۔ 1839ء میں چین کے حکمرانوں نے اس غیر قانونی تجارت کو روکنے کی کوشش کی لیکن انہیں "افیون کی جنگ" میں شکست ہوئی اور انہیں اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو ہانگ کانگ سمیت پانچ بندرگاہوں میں تجارتی سہولتیں فراہم کریں۔

یورپ نے نو آبادیات کی پیداوار کو سرمایہ کاری میں استعمال کیا، سوئز کنال کے شروع ہونے سے (1869ء) بھاپ کے انجن کی اور ریلوے کی بنیاد کے بعد یورپی صنعتوں کے لئے منڈیوں کا بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ 1912ء تک برطانیہ نے 14 فیصد ریلوے لائن بچھانے پر خرچ کیا، انہوں نے نو آبادیات کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے اس بات کی بھی کوئی کوشش نہیں کی کہ اندرونی تجارت کو فروغ دیں یا لوگوں کی سہولت کے لئے پبلک ٹرانسپورٹ کو بہتر بنائیں۔ ان کا تمام رجحان اس طرف تھا کہ نئی منڈیاں کیسے حاصل کی جائیں اور خام مال کس طرح سے زیادہ سے زیادہ لیا جائے۔ اس لئے نو آبادیات کی پیداوار کھیتوں سے سیدھی بندرگاہوں پر لائی جاتی اور وہاں سے جہازوں میں لاد کر انہیں یورپ لے آیا جاتا تھا۔

1880ء تک افریقہ کا ایک حصہ نو آبادیاتی نظام کے تحت آیا تھا جس میں کیپ کالونی، بوئر کے جمہوری علاقے، الجزائر اور تیونس تھے۔ یورپ کا اثر صرف ساحلی علاقوں تک محدود تھا لیکن یورپ کو اب افریقہ کی ضرورت تھی۔ یہاں کی معدنی کانیں، منڈیوں اور لوگوں کی محنت کو وہ اپنی صنعت کے لئے لازمی خیال کرنے لگے تھے۔ اس لئے اس صدی کی ابتداء میں افریقہ کی خود مختاری کو گن بوٹ کی طاقت کے ذریعہ ختم کیا گیا۔ یہ گن بوٹ اب اس مقصد کے لئے آئی تھیں کہ غلامی کی تجارت بند ہونی چاہئے کیونکہ اب افریقی غلاموں کی محنت و مزدوری کی امریکہ کو ضرورت نہیں تھی بلکہ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ افریقہ میں رہتے ہوئے ان کے لئے پیداوار کو بڑھائیں۔ فرانسیسیوں نے اوگووے (OGOWE) کی زمینوں پر قبضہ کیا اور جگہ جگہ چوکیاں بنائیں تاکہ غلاموں کی تجارت کو روکا جا سکے، پھر یہ بڑھتے بڑھتے کانگو کی وادی تک گئے۔ جیسے جیسے یہ بڑھتے یہ اپنی تجارتی چوکیاں قائم کرتے اور افریقیوں کی مزاحمت کو کچلتے چلے گئے۔ یہی ڈرامہ افریقہ کے دوسرے حصوں میں بھی کھیلا گیا۔

یورپیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک امن و امان نہیں ہو گا زرعی فارموں،

کانوں اور تجارت میں ترقی نہیں کر سکیں گے اور افریقہ کی دولت کو لوٹنے میں انہیں مشکل ہو گی۔ اس لئے انہوں نے مشنریوں اور جاسوسوں کو پورے افریقہ میں پھیلا دیا تاکہ وہ براعظم کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں۔ جب اسٹینلے لیونگ اسٹون سے مل کر آیا تو اس نے اعلان کیا:

"کانگو سے آگے 40 ملین لوگ آباد ہیں اور مانچسٹر کے کپڑے کے کارخانے اس بات پر تیار ہیں کہ انہیں لباس پہنا دیں۔ برمنگھم کی فیکٹریوں کے چولہوں میں تپا ہوا سرخ لوہا موجود ہے کہ انہیں اوزار فراہم کرے ۔۔۔ اور حضرت عیسیٰ کے پیروکار بے قرار ہیں کہ ان غریب کافروں کو عیسائیت کی آغوش میں لے آئیں۔"

یورپ میں اس وقت تک جرمنی، اٹلی اور بیلجیم، فرانس اور برطانیہ کی صف میں بحیثیت صنعتی ملکوں کے شامل ہو چکے تھے۔ 1883ء میں یہ برلن میں اکٹھے ہوئے تاکہ ایک معاہدہ کے تحت افریقہ کے حصے بخرے کئے جائیں۔ 1900ء تک وہ افریقہ کے براعظم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فتح کر چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس چونکہ زیادہ طاقت ور تھے اس لئے انہوں نے زیادہ زمین پر قبضہ کیا۔ لارڈ لوگارڈ جس نے یوگنڈا اور نائیجیریا کو برطانیہ کے لئے فتح کیا اس نے کہا کہ،

"افریقہ کی تقسیم جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بنیادی طور پر اقتصادی ضرورت کے لئے تھی تاکہ صنعتی یورپ کی خام مال اور غذا کی ضروریات پوری کی جائیں۔"

لیکن اس کے ساتھ اور دوسری وجوہات بھی تھیں جن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے سیسل روڈز جس نے جنوبی افریقہ میں سونے اور جواہرات کی شکل میں بڑی دولت اکٹھی کی وہ 1896ء میں اپنے تاثرات بیان کرتا ہے:

"میں لندن کے مشرقی علاقہ میں تھا۔ وہاں بے روزگاروں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا، وہاں میں نے جوشیلی تقریریں سنیں۔ لوگ مسلسل روٹی، روٹی، چیخ رہے تھے گھر واپس جاتے ہوئے میں نے اس مسئلہ میں غور کیا، اس کے بعد سے میں امپیریلزم کے حق میں اور زیادہ ہو گیا ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس سماجی مسئلہ کے حل کے لئے اور برطانیہ کے چار کروڑ لوگوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے ہم لوگ جو کہ نوآبادیات کے مدبرین میں سے ہیں، انہیں اور زیادہ زمین حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہاں ہمارے ملک کی آبادی کا ایک حصہ آباد ہو جائے۔ نئی نئی منڈیاں مل جائیں تاکہ جو کچھ فیکٹریوں اور کانوں میں پیدا ہوتا ہے اس کی کھپت ہو سکے۔"

افریقیوں کو اون، تمباکو، لکڑی، شکر، کیلا، کافی، مونگ پھلی، پام، تیل، روئی، کوکو، اور مونگ پھلی کی پیداوار پر لگا دیا۔ افریقی صرف ان فصلوں کی پیداوار کے بعد اس قابل ہو سکتے تھے کہ عائد شدہ ٹیکس دے سکیں۔ پھر تضادات بھی جلد ہی شروع ہو گئے مثلاً آئیوری کوسٹ کوکو پیدا کرتا تھا مگر اسے کوکو اور چاکلیٹ کے ڈبے درآمد کرنا پڑتے تھے۔ سوڈان روئی پیدا کرتا تھا مگر کپڑا اسے یورپ سے لینا پڑتا تھا۔ یہ تھی نوآبادیاتی نظام کی منطق۔

اس کے بعد معدنیات کی لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں کانوں کی کھدائی کر کے سونا، تانبہ، جواہرات، ٹن، لوہا اور زنک کو زیادہ سے زیادہ نکالا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ معدنیات کا نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ہی بالکل خاتمہ ہو گیا۔ والٹر روڈنی نے واضح طور پر بتایا ہے کہ اس عمل سے کون فائدہ میں رہا۔

"دوسری جنگ عظیم کے بعد سے گنی سے باکسائٹ (BAUXITE) کو لے جایا گیا۔ فرانسیسی اور امریکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں یہ باکسائٹ المونیم بن گئی اور بڑے بڑے صنعتی ملکوں کے شہروں میں اس سے بجلی کا سامان، سگریٹ کے فوائل، باورچی خانے کے برتن، شیشے کا سامان، زیورات کے ڈبے اور ایئر کرافٹ میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ گنی کے باکسائٹ کی وجہ سے جہاز رانی میں ترقی ہوئی اور شمالی امریکہ کی ہائیڈرو الیکٹرک پاور کو فروغ ہوا۔ جب کہ گنی میں نوآبادیاتی دور کی باکسائٹ کی کانوں میں صرف گہرے گہرے سوراخ باقی رہ گئے۔"

نوآبادیات میں مزدوری کی شرح بہت کم ہوا کرتی تھی۔ 1930ء کی دہائی میں نائیجیریا میں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کو دن بھر میں صرف ایک شلنگ ملا کرتا تھا۔ روڈیشیا میں مزدور کو مہینے میں 7 شلنگ تنخواہ دی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اتنی کم مزدوری پر شرح منافع بہت زیادہ تھی۔ اس لئے سرمایہ دار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان ملکوں میں نئی نئی مشینوں کا استعمال کیا جائے۔

یورپی مداخلت کا ایک اور جاں کن نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے روایتی پیداواری طریقے ختم ہو گئے اور افریقی ملکوں کی باہمی تجارت کو زبردست دھچکا لگا۔ کانگو میں بیلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ دوم کی سخت پالیسی کے نتیجہ میں وہاں کی 20 ملین آبادی بیس سال میں صرف 10 ملین رہ گئی اور جو باقی بچے انہیں غلاموں کی حیثیت سے ربڑ پیدا کرنے کے لئے کام پر لگا دیا۔ ای۔ ڈی۔ موریل نے کانگو وادی میں فرانسیسی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مقامی لوگوں کے گاؤں کو جلانا، انہیں جسمانی اذیتیں دینا، کوڑے مارنا، ان کی

عورتوں کی عزت لوٹنا اور لوگوں کو دریا اور کے لئے بطور نشانہ استعمال کرنا عام تھا۔"

آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے:

"تمام ملک بدل گیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شدید بھاری بہت بڑا سیلاب آیا ہو' وہ علاقے جہاں گنجان آبادیاں تھیں اب بکھرے ہوئے لوگوں کی آماجگاہ ہیں۔ تجارتی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے بعد اب وہ مکمل جہالت میں ہیں۔"

جیسے جیسے سرمایہ داری بڑھی ویسے ویسے بڑی بڑی کارپوریشنوں نے چھوٹی کمپنیوں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا اور اپنی اجارہ داریاں قائم کر لیں۔ "دی یونائیٹڈ افریقہ کمپنی (UAC)" "کمپنی فرانسیز دو افریک" اور "یونائیٹڈ ٹریڈنگ کمپنی" جیسی بڑی کمپنیوں نے نوآبادیاتی دور میں جنم لیا۔

یو اے سی نے لیوریں میں صابن بنانے کا کام شروع کیا تھا اور آخر کار افریقہ میں اس نے لیور برادرز سے اشتراک کر لیا اور یونی لیور کے نام سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پام آئل' صابن اور مارجرین بنا کر یونی لیور بین الاقوامی طور پر ایک بڑی کارپوریشن بن گئی۔

یورپ کی طاقتوں نے افریقہ کے علاوہ ایشیا کے بہت سے ملکوں کو فتح کر لیا تھا اور ان کے کیمپ میں تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔ ان نئے آنے والوں میں امریکہ سب سے زیادہ اہم تھا جو ایک صنعتی ملک بن چکا تھا' جاپان میجی انقلاب کے بعد صنعت کے میدان میں داخل ہو گیا تھا اور تھوڑا بہت روس بھی ان میں شریک ہو گیا تھا۔ اس لئے اب ان کی نگاہیں مزید اور ملکوں کو ہڑپ کرنے پر تھیں' ان میں خصوصیت سے عثمانی سلطنت اور ہیپسبرگ (آسٹرو ہنگری) تھے لیکن اب دوسرے ملکوں پر قبضہ اتنا سہل نہیں رہا تھا۔ چار صدیوں کی فتوحات کے بعد دنیا کے ملکوں کی سرحدیں بند ہو چکی تھیں اور امپریلسٹ طاقتوں میں حریفانہ کشمکش کی ابتداء ہو چکی تھی' کیونکہ اب علاقوں پر قبضہ اسی طرح سے کیا جا سکتا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے چھینے جائیں۔

اس کیمپ میں نئے شامل ہونے والے جرمنی اور اٹلی اپنے حصوں سے خوش نہیں تھے اس لئے جرمنی نے روس کو نظرانداز کرتے ہوئے ہیپسبرگ اور عثمانی سلطنتوں کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہا۔ جب جرمنی آسٹرو ہنگری اور عثمانیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تو برطانیہ' فرانس اور روس اس سے پریشان ہو گئے اور انہوں نے آپس میں ملاپ کر کے خود کو "اتحادی طاقتیں" کہا اور دونوں گروہوں میں اختلاف سے پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی۔ اٹلی' جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اتحادیوں کا ساتھ دیا کیونکہ ان کو امید تھی کہ اس صورت میں انہیں زیادہ حصہ مل جائے گا اور ہوا بھی یہی کہ جب دوسری یورپی طاقتیں آپس میں مصروف جنگ

تھیں تو جاپان نے چین کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ جب 1917ء میں روسی انقلاب آیا تو روس تصادم سے علیحدہ ہو گیا اور اپنی ساری توجہ خود کو صنعتی ملک بنانے پر مرکوز کر دی۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں جرمنی' آسٹریا اور ترکی کو شکست ہوئی۔ جرمنی کو نہ صرف اپنی یورپی فتوحات سے ہاتھ دھونا پڑے بلکہ اس کی نوآبادیات پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔ مشرقی یورپ میں گماشتہ ریاستیں بنائی گئیں اور انہیں اتحادی طاقتوں کے ماتحت کر دیا گیا۔ اٹلی اور جاپان کو بھی اس سے تھوڑا بہت فائدہ ہوا لیکن ان کی ہوس پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تاکہ وہ لوٹ میں زیادہ مال غنیمت حاصل کر سکیں۔ نوآبادیات کے عوام کو ان جنگوں میں جیسا کہ چنی دے رہنے کا فوجوں میں بھرتی کر کے انہیں امپیریلسٹ آقاؤں نے اپنے مفادات کی خاطر جنگ کے شعلوں میں دھکیل کر قربان کر دیا۔

اسی دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے براعظم امریکہ میں اپنی اجارہ تشکیل دی۔ صنعتی ترقی کی کامیابی کے بعد شمالی اور جنوبی ریاستوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شمالی ریاستیں چاہتی تھیں کہ جنوب کے زرعی فارموں سے غلامی کا خاتمہ کیا جائے تاکہ غلاموں کی آزادی کے بعد انہیں اپنی صنعتوں کے لئے سستی مزدوری مل جائے۔ اس کے بعد سے امریکہ کی وسعت کی خواہشات یورپ کی طرح بڑھتی چلی گئیں۔ کیونکہ اسے بھی خام مال کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیوں کی ضرورت تھی۔ 1898ء کی ہسپانوی امریکی جنگ میں' امریکہ نے فلپائن' کیوبا' پیورٹوریکا' گوام اور دوسرے جزائر پر قبضہ کر لیا جو کہ ہسپانوی ریاست کے قبضہ میں تھے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امریکہ کی خاصی آبادی گن بوٹ کی پالیسی کی مخالف تھی' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ علاقائی پھیلاؤ اور فوجی طاقت امریکی ریاست کے بانیوں کے بنیادی نظریات کے خلاف تھی (یہاں اگرچہ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نیگروز اور ریڈ انڈین کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا' اس کے بارے میں ان کی کیا رائے تھی؟) اس لئے نوآبادیات کے سلسلہ میں امریکہ نے دوسری اپروچ رکھی۔ اس نے فلپائن کو آزادی کی امید دلائی (جو 1946ء میں جاکر پوری ہوئی) اور لاطینی امریکہ کو رسمی طور پر نہیں بلکہ غیر رسمی طور پر نوآبادیات بنایا۔ تاکہ سامنے آنے کے بجائے چھپ کر ان پر حکومت کی جائے۔

1823ء میں منرو نظریہ کے تحت' امریکہ نے لاطینی امریکہ کو اپنے تحفظ میں لے لیا' بعد میں روز ویلٹ نے منرو نظریہ کو توسیع دیتے ہوئے اس علاقہ میں اپنے اثرات کو اور بڑھا لیا اور اپنی مداخلت کے جواز کے لئے اعلان کیا کہ:

"اگر کسی معاشرہ میں ایسی بنیادی خرابی اور بے عملی ہو جو ایک مہذب معاشرہ کو توڑنے کا سبب بنے تو براعظم امریکہ اور دوسرے علاقوں میں مہذب اقوام کی مداخلت ضروری اور لازمی ہو جاتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ منرو نظریہ کے تحت اس بات پر مجبور ہے کہ لاطینی امریکہ میں بنیادی خرابیوں اور بے عملی کی صورت میں بین الاقوامی پولیس طاقت کو استعمال کرے۔"

یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک غیر رسمی معاہدہ ہوا جس کے تحت امریکہ نے وعدہ کیا کہ وہ یورپ کی نوآبادیات کے معاملات میں دخل نہیں دے گا بشرطیکہ یورپ لاطینی امریکہ کو اس کے لئے چھوڑ دے۔

امریکہ نے اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور لاطینی امریکہ کے ذرائع کا استحصال کرنے کی غرض سے وہاں ایسی فصلوں کی کاشت شروع کی جس سے جلد پیسہ کمایا جا سکے۔ اس طرح لاطینی امریکی ملک بھی دوسری نوآبادیات کی طرح ہو گئے۔ اگرچہ کہنے کو یہ خود مختار تھے مگر ان کی خود مختاری ریاست ہائے متحدہ کی مرضی پر منحصر ہوا کرتی تھی۔ اسی کی پالیسی کے تحت یہاں حکومتیں بدلتی رہا کرتی تھیں اس لئے اس نے ایسی تمام قومی تحریکوں کو سختی سے کچل دیا جو آزادی کی جدوجہد کر رہی تھیں' اس غیر رسمی امپائر نے آگے چل کر نیوکولونیل ازم کی بنیاد ڈالی۔

نوآبادیاتی نظام کے علم بردار یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ سفید آدمی کا بوجھ تھا کہ وہ غیر مہذب اقوام کو مہذب بنائے۔ ان کے لئے اسکول' ہسپتال اور رہنے کی سہولتیں مہیا کرے تو کیا اس نظام نے دنیا کی تہذیب کو فائدہ پہنچایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظام نے تہذیب کو بلکہ نہیں دیا اور یہ محض ایک مفروضہ ہے کہ جو اس کے حامیوں نے لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے گھڑا تھا۔

1934ء میں جب کہ برطانیہ ایک فلاحی ریاست نہیں ہوا تھا' یہاں سماجی بہبود پر ایک شخص کیلئے 6 پونڈ 10 شلنگ خرچ ہوتے تھے' جب کہ نائیجیریا میں ایک شخص پر 2 شلنگ سے بھی کم خرچ کیا جاتا تھا۔ والٹر روڈنی صحت کے اخراجات کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ:

"ابادان جو کہ افریقہ کا سب سے زیادہ گنجان آبادی والا شہر تھا' وہاں آخری جنگ سے پہلے صرف 50 یورپی تھے' ان چند افراد کے لئے برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے 11 بستروں کا آراستہ و پیراستہ ہسپتال علیحدگی کی بنیاد پر قائم کر رکھا تھا جب کہ آدھے ملین لوگوں کے لئے 34 بستروں کا ایک ہسپتال تھا۔"

اس لئے اس نظام میں جو تھوڑی بہت سہولتیں تھیں وہ بڑے شہروں تک محدود تھیں'

جب کہ دیہاتوں میں جہاں سے وہ زراعت کی پیداوار سے پیسہ کماتے تھے' سہولتوں کا فقدان تھا۔ اس نظام میں خصوصیت سے ایسی تمام زرعی اور صنعتی پیداوار جس سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا تھا انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ والٹر روڈنی نے لکھا ہے کہ:

"مزدوروں اور کسانوں نے یورپی سرمایہ داروں کے لئے مخصوص قسم کی اشیاء پیدا کیں اور ان کی محنت کا صلہ معمولی تنخواہوں کی شکل میں انہیں ملا۔ انہیں وہ معمولی سہولتیں بھی نہیں دی گئیں جو نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھیں' جب کہ تمام آمدنی پر قبضہ یہ تھے۔"

اس نظام میں ایک خاص قسم کے تعلیمی نظام کو رائج کیا گیا جو اس کو تقویت دے۔ لوگوں کو اس قسم کے مقدس گیت اور دعائیہ نغمے یاد کرائے گئے جو انہیں مسیحیت کا غلام بنا دیں۔ ان کا مقامی کلچر اور تاریخ اندھیرے میں چلی گئی' انہیں صرف اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے محبت کرنا اور ان کی اطاعت کرنا سکھایا گیا۔ افریقیوں سے تو یہ کہا گیا کہ یورپیوں کی آمد سے قبل ان کی کوئی تاریخ ہی نہیں تھی اور ان کو اہل یورپ نے مہذب بنایا ہے۔ اس کے نظام تعلیم نے ایسے چیدہ لوگوں کے طبقہ کو پیدا کیا جو ان کا وفادار تھا اور ان کے لئے انتظامیہ کے نچلے عہدوں پر کام کرتا تھا۔

اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی ہمیشہ سے مخالفت کی گئی مثلاً 1919ء اور 1926ء میں سیریہ لیون میں ریلوے ملازمین نے ہڑتالیں کیں۔ گولڈ کوسٹ میں کوکو کے کاشتکاروں نے اپنی فصلوں کو اہل یورپ کے ہاتھوں کم قیمت پر فروخت سے انکار کر دیا۔ عورتوں نے بار بار ظالمانہ ٹیکسوں کے خلاف مزاحمتیں کیں۔ دیکھا جائے تو احتجاج کی یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے یورپی امپائر کے ڈھانچہ کو کمزور کر دیا اور تیسری دنیا کے ملکوں سے آزادی کی آوازیں شدت سے بلند ہونا شروع ہو گئیں' ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اس وقت ان تحریکوں کی حمایت کی تاکہ وہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا سکے۔

1949ء میں ماؤ نے چین سے غیر ملکی طاقتوں کو باہر نکال پھینکا۔ ہندوستان نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ اسے آزادی دے۔ اس کے بعد سے ایک نیا عہد پیدا ہوا' لیکن جو نقصان تیسری دنیا کو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

جن والٹر روڈنے آزاد دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے' مغرب اور بقایا ممالک۔ ان بقایا میں سے صرف روس اور جاپان نے نوآبادیاتی نظام کی مزاحمت کی اور اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور خود بھی صنعتی طاقت بنے۔ دوسرے ممالک یا تو مکمل طور پر نوآبادیاتی نظام کا شکار ہوئے یا

اس سے تھوڑا بہت متاثر ہوئے اور اسی لئے آگے چل کر یہ غیر ترقی یافتہ رہ گئے اور انہیں ملکوں کو اب تیسری دنیا کہا جاتا ہے۔

مقامی لوگوں کی جدوجہد
آسٹریلیا، امریکہ، نیوزی لینڈ

راجر موزلی

نوآبادیاتی نظام کس طرح سے عمل میں آیا؟ اور کس طرح تین سو سال کے عرصہ میں پانچ تجارتی طاقتوں نے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے مسالہ جات حاصل کرنے کے لئے راستوں پر کنٹرول کیا، مشہور افسانوی خطہ ریشمین ال ڈوراڈو (El DORADO) پر قبضہ کیا اور جہاں جہاں آبادیاں تھیں ان علاقوں میں سیاسی اقتدار قائم کر کے انہیں اپنی نوآبادی بنایا؟ تاریخ کا یہ عمل اب دنیا کے سامنے ہے۔ اس عمل میں ہزارہا لوگ تباہ و برباد ہوئے اور مقامی باشندوں نے اپنے ذرائع پیداوار اور اپنے کلچر کو خود چھنتا ہوا دیکھا، وہ مایوس کن تبدیلی کا شکار ہوئے۔

جن علاقوں کو فوجی فتح نہیں کر سکے تھے وہاں پر سونے کے متلاشی، شکاری، سمندری لٹیرے اور زمینوں پر قبضہ کے خواہش مندوں نے دھاوا بول دیا، زمینوں پر قبضہ کر کے وہاں کے مقامی باشندوں کو پیچھے دھکیل دیا جہاں وہ یا تو فاقہ سے یا چیچک، ہیضہ، انفلوئنزا اور جنسی بیماریوں کی وجہ سے مر گئے۔ صرف ان علاقوں میں جہاں کہ فتوحات کے اثرات ابتداء میں کم ہوئے وہاں پر مقامی اور یورپی باشندوں میں مفاہمت ہوئی جیسے چین اور ہندوستان۔ ان ملکوں میں صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کی شکست نے پورے ملک کو مفتوح بنا دیا اور وہاں کے بدعنوان گورنروں اور بدعنوان انتظامیہ کی جگہ سفید امپیریلزم نے لے لی۔ بیسویں صدی کے شروع میں سوائے بحرالکاہل کے چند حصوں، آرکٹک اور ایمیزون کے اندرونی علاقوں کے تمام علاقے اپنی خود مختاری کھو چکے تھے اور یورپی امپیریلزم کے ماتحت آ چکے تھے۔

امپیریلزم کے اس عمل میں جو کچھ ظلم و ستم ہوا، اس میں بہت سے دوسرے عوامل کو اب تک نظر انداز کیا گیا لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں جو کہ مقامی باشندوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے کی اس سے ان کی تاریخ اور کلچر کے نئے نئے پہلو سامنے آئے ہیں جس سے نوآبادیاتی نظام کی تاریخ کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس تحقیق سے حیران کن حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مقامی لوگوں نے سفید اقوام

سے جنگوں میں جتنی جنگیں ہاریں اسی قدر جنگوں میں انہیں کامیابی ہوئی اور ان حالات میں جب کہ ان کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس ہتھیاروں کی بھی کمی تھی مگر اس کے باوجود وہ کم جنگوں میں شکست خوردہ ہوئے۔ انہوں نے گوریلا طریقہ جنگ اختیار کرتے ہوئے انگریز آبادیوں پر حملے کئے۔ شمالی آسٹریلیا کے علاقے خصوصیت سے کوئنز لینڈ میں مقامی آبادی نے انیسویں صدی تک سفید فام لوگوں سے کوئی تعلقات نہیں رکھے تھے یہاں تک کہ مشنریوں نے ان سے اشیاء کے تبادلہ کے ذریعے تعلقات پیدا کئے اور انہیں اوزار' آٹا اور تمباکو دے کر ان سے محنت و مزدوری کے کام لئے۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کے سپاہی وہاں کامیاب ہوئے جہاں کہ بادشاہ کے سپاہی ناکام ہو گئے تھے۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے مقامی لوگ در آمد شدہ بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے لگے' اس طرح دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں آسٹریلیا کے باشندے قتل عام کے ذریعہ نہیں بلکہ یورپی بیماریوں کے ذریعہ مرے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مقامی باشندوں میں تنظیم نہیں تھی یا ان کا کوئی کلچر نہیں تھا وہ فوجی اور سماجی دونوں لحاظ سے انتہائی منظم تھے' ہنری رینالڈ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> "مقامی باشندے نہ تو یورپی حملوں کے نتیجہ میں خاموش رہے اور نہ ہی نئے آنے والوں کی طور طریق سے بے خبر رہے۔ تاریخی شواہد اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ان کا کلچر جامد' غیر تغیر پذیر اور تنگ نہیں تھا' اور ان لوگوں میں حالات کی تبدیلی اور نئے تقاضوں کے تحت بدلنے کا جذبہ اہل یورپ کی طرح سے تھا۔ اپنے کلچر اور روایات کے تحفظ کے لئے انہوں نے تبدیلی کے خلاف مزاحمت بھی کی۔ ان کا معاشرہ اگر ایک طرف بہت زیادہ رجعت پرست تھا تو دوسری جانب اس میں بڑی تخلیقی صلاحیتیں بھی تھیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ان کا کلچر تنگ دائرے میں گھٹا ہوا تھا اور اسی لئے وہ یورپی اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکے اور ان کے مقابلہ میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گئے۔"

ہنری رینالڈ اور دوسرے مورخوں کی روایت شکن تحقیقات سے جو مقامی باشندوں کی تاریخ سامنے آئی ہے اس سے ان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ پتھر کے زمانے کے لوگ تھے' اور ان کے ذرائع پیداوار بڑے محدود تھے۔ اس لئے وہ یورپی اقوام سے یہ "اصلی شکست کھا گئے" سب غلط ثابت ہو گیا ہے "تقریباً" پانچ سو یا اس سے زائد قبائلی' جو یورپی حملوں کے وقت اس براعظم میں رہ رہے تھے ان میں سے بہت سے بہترین کاشت کار' ماہی گیر اور کان کن تھے' جو مکانوں میں رہتے تھے' کھیتی باڑی کرتے تھے اور ان کی آبادیوں کے ایک دوسرے سے تعلقات

تھے۔ جب سفید لوگ آئے تو انہوں نے ان سے تجارت بھی کی اور ان کی چیزوں کی چوری بھی کی' اور ان کے ساتھ تعلقات میں خوشامد و چاپلوسی سے اپنے مقصد کو بھی حاصل کیا۔ اگرچہ ان کا قتل عام بھی ہوا اور ہزاروں مقامی باشندے یورپی اقوام کے ہاتھوں مارے گئے (مقامی لوگوں کو اس صدی تک شوٹ کیا جاتا رہا ہے) لیکن انہوں نے بقا کے لئے سخت مزاحمت کی اور نئے حملہ آوروں سے مقابلہ کیا' 1870ء کی دہائی میں ایک سفید فام ایکسپلورر نے مقامی باشندوں کے مقابلہ کی تفصیل دی ہے کہ کس طرح سے وہ مسلح مقامی باشندوں نے انہیں دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پکارا "سفید آدمی آگے آؤ' آگے آؤ۔"

> "پہلی نظر میں ان کی فوج بڑی متاثر کن نظر آئی ... اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کالے انڈین ہیں جو کہ تنظیم کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے ہیں' انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے کھڑے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ قواعد سے پوری طرح واقف ہیں۔"

لیکن مقامی باشندوں کا اس طرح سے مل جل کر رہنا اور ان میں اس قدر تنظیم کا ہونا ہی ان کے لئے خطرناک ہوا۔ اس وجہ سے ان میں بیماریاں اس طرح سے پھیلیں جیسے جنگل میں آگ۔ مقامی آبادیوں کو ختم کرنے میں یہ انتہائی اہم عنصر تھا۔ نوئل بٹ لن (NOEL-BUTTLIAN) نے تحقیق کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آسٹریلیا کی فتح کے بعد اس کی آبادی کو صحیح نہیں بتایا گیا اور اعداد و شمار کم کر کے بتائے گئے تاکہ جو قتل ہوئے یا جن کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا' یا جو لوگ بیماریوں سے مرے' ان کی تعداد کم ہو جائے۔

اسی پس منظر میں اگر ہم جنوبی اور وسطی امریکہ کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بہت واضح ہوگی کہ انکا (INCA) کی وسیع و عریض سلطنت اس قدر کمزور نہ تھی کہ اسپین کے حملہ کی صورت میں فوراً ہی وہ ختم ہو جاتی۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اسپینی فاتحین کو انکا کے فوجیوں نے شکست دی۔ اور بہت ہی مشکلوں میں انہیں کامیابی ہوئی۔ اسپینی فتوحات میں تقریباً 50 سال صرف ہوئے اور اس عرصہ میں دونوں طاقتوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔ سازشوں اور غداری سے ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچایا گیا۔ انکا خاندان کا ایک جانشین اٹھارویں صدی تک زندہ تھا اور اسپین کی حکومت کے حامیوں میں سے تھا۔ اس طرح پیرو اور کولمبیا کے مقامی انڈین جو کہ انکا سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں۔ وہ اس وقت جنوبی امریکہ کے سب سے زیادہ پرتشدد گروہوں میں سے ہیں۔

جیسا کہ آسٹریلیا میں بیماریوں نے مقامی آبادی کو ختم کیا' اسی طرح امریکہ میں وہ یورپی

بیماریوں کا شکار ہوئے۔ مزید یہ کہ ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے انھیں ان کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دیا گیا اور ہزار ہا عورتیں، بچے اور مرد کانوں میں کام کرنے کی وجہ سے مر گئے۔ ان مختلف وجوہات کی وجہ سے 150 سال میں 70 ملین کی آبادی گھٹ کر 4 ملین رہ گئی۔ 1492ء میں جنوبی امریکہ میں 49 ملین لوگ آباد تھے جن میں سے 96 فیصد ابتدائی دہائیوں میں ختم ہو گئے۔ اگر ان مرنے والوں میں ان کو بھی شامل کر لیا جائے جو آگے چل کر 400 سال میں مرے تو ان کی تعداد 100 ملین ہو جاتی ہے۔ (ان میں وہ شامل نہیں جو کھانسی، خسرہ اور انفلوئنزہ کی وجہ سے مرے) اس بحث سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقامی لوگ محض یورپیوں کے قتل عام کی وجہ سے تباہ و برباد نہیں ہوئے بلکہ اس میں بیماریوں کا بھی حصہ تھا۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ یورپی لوگوں کی بہادری اور جرأت نے مقامی آبادی کو تہس نہس کر دیا۔ انہوں نے یورپیوں کا مقابلہ کیا اور میدان جنگ کے علاوہ سماجی، معاشی میدان میں اپنی بقا کی جدوجہد کی اور کامیاب رہے۔

ایک اور انکشاف جو ہماری روایتی تاریخ کے مفروضے کو مسترد کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مقامی اقوام نے بہت سی جنگوں میں کامیابی حاصل کی اور یورپیوں کو شکستیں دیں اور ان کی خود مختاری کا خاتمہ یورپی دھوکہ بازی اور فریب کی وجہ سے ہوا۔ انیسویں صدی کے دوران شمالی امریکہ میں جو ریڈ انڈین سے معاہدے ہوئے ان کی تعداد 400 کے قریب ہے، اور ان میں سے اکثر معاہدے مساوی بنیادوں پر ہوئے تھے۔ 1866ء میں فورٹ لارامی (FORT LARAMIE) کا معاہدہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس معاہدے میں دس سال کے اندر اندر سیوکس (SIOVX) قبیلے سے کئی معاہدوں کے بعد انہوں نے زبردستی کی ترمیمیں کیں۔ اصل معاہدے میں 30 ملین ایکڑ اراضی کی ضمانت دی گئی تھی جو کہ بعد میں آہستہ آہستہ ان سے چھینی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ 1862ء کی سیوکس بغاوت کے بعد یہ گھٹ کر صرف 10 میل کے پلاٹوں میں رہ گئی۔

1874ء میں پاہا ساپا (PAHA SAPA) میں سونا دریافت ہوا تو حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک کمیشن بھیجا کہ اس علاقہ کو خرید لیا جائے۔ اس پر وہاں سخت رد عمل ہوا اور لاکوٹا قبیلہ نے اسے مار بھگایا۔ اس کے بعد 1876ء میں کسٹر کی مہم انہیں سزا دینے کے غرض سے بھیجی گئی لیکن اسے مشہور جنگ (LITTLE BIG HORN) میں بری طرح شکست ہوئی، لیکن اگلے سال ہی سینٹ میں غیر قانونی طور پر ایک بل پاس کر کے زمین پر قبضہ کو جائز قرار دے دیا۔ رائے شماری میں صرف 10 فیصد نے لاکوٹا کی حمایت کی۔

ایک مورخ نے اس سوال کو اٹھایا ہے کہ لاکوٹا نے کیوں ایک ایسے معاہدے پر

دستخط کئے جس میں ان کی زمین ان سے چھین لی گئی حالانکہ جنگ میں انھوں نے فتح حاصل کر لی تھی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ ان سے امن کا خواہاں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام اور اس کی تجارت سے مقامی باشندوں پر جو گہرے اثرات ہوئے، جس نے ان کے نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"انیسویں صدی میں سیوکس نے سمور کی تجارت میں مہارت حاصل کر لی تھی اور وہ بھینسے کی کھالیں اور اس کی مصنوعات کی تجارت سفید فام لوگوں سے کرتے تھے وہ اس کے بدلہ میں ان سے ہتھیار، بندوقیں اور کھانے پینے کی اشیاء خریدتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے کاشت کاری چھوڑ کر اپنی ساری توجہ بھینسوں کے شکار کی جانب کر دی جنگلی کھالوں پر ان کا گزارا ہونے لگا اور جن کے بدلہ میں انہیں تیار اور بنی بنائی چیزیں ملنے لگیں۔"

لیکن جب سے بھینسوں کے گلے کم ہونے لگے، لاکوٹا کا انحصار اپنے دشمنوں پر زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا گیا اس صورتحال کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ زمینوں پر قبضہ کیا گیا۔ خاص طور سے 1884ء میں داس کمیشن (DAWAS COMMISSION) نے معاہدہ کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سے ان ریزرو علاقوں کا بھی کوئی تقدس باقی نہیں رہا جو کہ انتظامیہ نے انڈین کے لئے علیحدہ کر دیئے تھے اور مقصد یہ تھا کہ یہ تاجروں، ریل روڈ کے مالکوں، زرعی فارموں کے خریداروں اور تیل تلاش کرنے والوں سے محفوظ رہیں اور انڈین مسئلہ کے آخری حل (FINAL SOLUTION) سے محفوظ رہیں۔ لیکن 1934ء میں جب انڈین ری آرگنائزیشن ایکٹ پاس ہوا تو ان کی زمین غیر قانونی طور پر قبضہ میں لائی جا چکی تھی 150 ملین میں سے 90 ملین ایکڑ زمین چھن چکی تھی۔ یہ وہ خاموش قتل عام تھا جس سے مقامی باشندے متاثر ہوئے۔

1930ء کی دہائی میں اگرچہ ان معاہدوں کی حیثیت صرف ایک قسم کی ہو کر رہ گئی تھی، لیکن بعد میں یہی معاہدے انڈین کے ہاتھوں میں موثر ہتھیار ہو گئے اور ان کی مدد سے انہوں نے اپنی بچی ہوئی زمینوں کو کمپنیوں اور کانوں کے مالکوں کے ہاتھوں سے بچایا۔ کینیڈا کے دور میں ان کے پرتشدد ہنگاموں کی وجہ سے ان کی زمینوں کو ہڑپ نہیں کیا جا سکا۔ کچھ قبیلوں نے نقدی کی صورت میں اپنے معاہدوں کا معاوضہ وصول کر لیا لیکن لاکوٹا قبیلہ نے جس کی مدد انٹرنیشنل انڈین کونسل نے کی اس نے مزاحمت کی اور حق خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔

یہی صورت حال نیوزی لینڈ میں ہوئی جہاں مقامی باشندوں (MAORI) کے ساتھ کیا گیا

معاہدہ وتانگی (WAITANGI) انتظامیہ کے ہاتھوں بار بار مسخ ہوا اور اس کی خلاف ورزی کی گئی۔ 1840ء میں اسی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے اور یہ ان معاہدوں میں سے تھا جس پر دونوں طاقتوں نے مساوی حیثیت میں دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ میں مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں، جنگلوں اور ماہی گیری کے ابدی حقوق دیئے گئے تھے۔ اور ایک شرط یہ تھی کہ فروخت کی صورت میں یورپیوں کو پہلا موقع دیا جائے گا۔ لیکن اس معاہدہ اور اس کی دفعات کو بار بار توڑا گیا۔ جس کے رد عمل کے طور پر مقامی لوگوں نے سفید فام لوگوں پر حملے کئے، انہوں نے ان حملوں کو بہانہ بنا کر ان زمینوں پر قبضے کئے۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مقامی مورخ وتیری ولیمز (WAITIRI WILLIAMS) نے جو کہ خود موری ہے، بتایا ہے کہ موری زمینوں پر قبضہ کرنے کا ایک سوچا سمجھا اور باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا جس کے ذریعہ "پاکے ہا" (سفید) برتری کو قائم کرنا تھا۔

ابتداء میں مشنریوں نے موریوں کے روحانی عقائد پر حملے کئے اور ان کا زمین سے جو رشتہ تھا اسے کمزور کیا۔ 1814ء میں پہلی زمین جو خریدی گئی اس میں 200 ایکڑ کی قیمت ایک درجن کلہاڑیوں کی صورت میں ادا کی گئی۔ وتانگی معاہدہ جیسا کہ ولیمز نے بتایا ایک خالی خولی وعدہ تھا اور "پاکے ہا" اس کو پورا کرنے کے متعلق خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن اس کے ذریعہ انہوں نے مقامی لوگوں کے خدشات کو دبا دیا اور جیسے جیسے سفید لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمینوں پر غیر قانونی طور پر قابض ہوتے گئے۔

1860ء کی دہائی میں نئے آنے والے انگریزی قانون اور بدعنوان عدالتوں کی مدد سے زمینوں پر قبضہ کرتے رہے۔ طریقہ یہ تھا کہ موری جن میں زمین پر اجتماعی ملکیت کا تصور تھا، انہیں بلایا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ اپنی زمین میں دس یا بارہ حصہ دار رکھ لیں۔ ان سے یہ کہا جاتا کہ یہ قبیلے کے نمائندے ہیں لیکن حقیقت میں وہ زمین کے مالک ہوتے تھے۔ جیسے ہی یہ رجسٹرڈ کیا جاتا، زمین پر قبضہ کرنے والے ان افراد کو گھیر لیتے اور ان افراد کا حصہ ہڑپ کر جاتے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ ان معاملات میں موری عدالت بالکل دخل نہ دے۔ زمین کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے اس عمل سے اور اس بہانے سے کہ موریوں نے اپنی زمینوں کے سروے کے اخراجات نہیں دیئے ہیں، تین دہائیوں کے اندر اندر ان کی 6/7 زمینوں پر یورپیوں کا قبضہ ہو گیا۔

بیسویں صدی کے اندر اندر زمینوں پر قبضہ کی جارحانہ پالیسی مزید واضح ہو کر سامنے آئی۔ 1967ء میں ایک ایکٹ کے ذریعے ایسی زمینوں پر جن پر چار یا ان سے کم موریوں کا قبضہ

تھا خود بخود ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ چھ سال بعد ایک اور ایکٹ کے ذریعہ زمین پر صرف انفرادی قبضہ جائز قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں موری اپنی زمینیں چھوڑ کر شہر میں آباد ہونے اور غربت کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ کالے موریوں کی زمینوں پر یا تو قبضہ کر لیا گیا، یا جو رہ گئے تھے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی غذائی ضروریات کے بجائے وہ فصلیں پیدا کریں کہ جن کی سفید فام لوگوں کو ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درآمد شدہ چیزوں "کھاد، بیج، کیڑے مار دوائیں، ٹرانسپورٹ اور اسٹوریج" کے لئے ان کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ ساتھ ہی ان کا مقابلہ بین الاقوامی منڈیوں سے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے معاہدے جو مساوی بنیادوں پر ہوئے ان کی کس طرح سے خلاف ورزی کی گئی اور کس طرح سے مقامی لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مقامی باشندوں نے اہل یورپ سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس کی مثال چیروکی (CHEROKEE) قبیلہ ہے جس نے 1820ء کی دہائی میں اپنی زبان کو لکھنے کی ابتداء کی اور اپنا ایک اخبار بھی چھاپنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں تعلیم کی غرض سے بھیجا۔ اگر ایک طرف چیروکیوں کو نئی تعلیم سے دلچسپی تھی، تو دوسری جانب مشنری انہیں مہذب بنانا چاہتے تھے۔ جب 1820ء کے دوران ریاست جارجیا نے کہ جس کو اینڈریو جیکسن کی رجعت پرست حکومت کی حمایت حاصل تھی چیروکیوں کو مجبور کیا کہ اوکلاہاما چلے جائیں (یہ علاقہ اس دور میں بہت سے مغربی قبیلوں کی قبر ثابت ہوا) تو اس کے رد عمل میں چیروکیوں نے اپنے حقوق کے لئے ایک اہم مہم چلائی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں

> "سفید گوری سے معاملات میں مقامی باشندوں کو بدترین قسم کے تجربات ہوئے، چیروکیوں نے جو مہم چلائی، تو ان کی صلاحیتوں اور جرات مندانہ اقدامات کی وجہ سے پوری قوم کی توجہ ان پر مرکوز ہو گئی، انہوں نے بڑی خوبصورتی سے سفید رائے عامہ کو اپنے حق میں بیدار کیا اور سفید قانونی ثالث سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔"

جب انہیں اس کے علاقے سے نکالنے کا مسئلہ آیا تو مشنری اس مسئلہ میں تقسیم ہو گئے، لیکن ان میں سے اکثریت نے خوشامد کی۔ چیروکیوں کی حمایت کی، اور ان سفید فام لوگوں کی مخالفت کی جو ان کی زمینوں پر قابض ہو رہے تھے۔ لیکن کچھ نے کھلم کھلا ان کا ساتھ دیا اور دو مشنریوں کو تو عملی جدوجہد میں حصہ لینے کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا لیکن 1835ء تک سفید فام لوگوں کی تعداد بڑھ گئی اور 15 ہزار یورپی چیروکیوں کی زمینوں پر آباد ہو گئے۔ اگرچہ ان کے احتجاج کی وجہ سے انہیں نکالنے کا فیصلہ منظور نہیں ہوا مگر بعد میں کچھ ووٹوں [illegible]

معاہدہ کو منظور کر لیا اور 5 سال بعد 14 ہزار لوگوں نے اوکلاہاما کی جانب پیدل مارچ کیا۔ اس بدنام زمانہ "آنسوؤں کے راستہ" کی بدولت کی مثال ریاست ہائے متحدہ کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ تقریباً" ان کا تیسرا حصہ سردی اور فاقہ سے مر گیا۔ فاقہ کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے ٹھیکے داروں نے کھانے کے راشن خود ہڑپ کر لئے۔ یہ ضرور ہوا کہ اس سے چیروکی کچھ عرصہ کے لئے لوگوں کے مجمع سے محفوظ ہو گئے اور انہیں چند سال سکون کے مل گئے۔

لیکن ایسی بھی کئی مثالیں ہیں جن میں مقامی باشندوں اور سفید لوگوں میں مفاہمت کے اچھے نتائج نکلے' دونوں نے ایک دوسرے سے جو سیکھا ان تجربات سے دونوں معاشروں میں صحت مند روایات کا ارتقاء ہوا۔ پانامہ کا کونا (CUNA) ان قبائل میں سے ہے جو اسپین کی فتوحات کے بعد بھی باقی رہا لیکن یہ اس لئے باقی رہا کہ اس نے پانامہ سے کیرے بین کے ساحلوں میں ہجرت کر لی اور اس طرح اسپینی فاتحین کے قتل عام سے بچ گیا۔ انہوں نے فرانسیسی اور انگریز بحری قزاقوں سے رابطہ قائم کیا اور 1925ء میں پانامہ کی پولیس فورس کو شکست دیکر سان بلاس کے جزیرے میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ اس کے مقابلہ میں سیبونی (CIBONY) اور کریبس (CRIBS) کا معاملہ مختلف ہے' جہاں بھی ان کا قبضہ تھا۔ وہاں اب ان کی نسلوں کے کچھ بچے کچھے لوگ باقی رہ گئے ہیں۔

کینیڈا اور الاسکا کے انوئٹ بیسویں صدی تک محفوظ رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب فوجی کارروائیوں کی غرض سے شمال کے راستے کھل گئے تو مہم جوؤں اور مشنریوں کا سیلاب ان علاقوں میں آ گیا۔ الاسکا میں تیل کی دریافت کے بعد سے مقامی لوگوں کو کارپوریشنوں سے راشن ملنے لگی (یہ بھی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے) ایک اسکیمو عورت نے پچھلی دہائیوں میں جو تبدیلی آئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

> "پچھلے زمانہ میں ہمارے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور کئے جاتے تھے لیکن پھر وہ ایک جگہ آباد ہو گئے اور مکانات بنا کر مستقل طور پر رہنے لگے۔ انہوں نے مچھلیاں پکڑنا اور ہرن کا شکار کرنا شروع کر دیا' اب ان کی حیثیت اسکیمو گلے کی سی رہی جو مسلسل متحرک رہتے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم ایک قوم نہیں رہیں گے' شکاریوں مشنریوں اور سونے کی تلاش میں آنے والوں نے ہمیں مسٹر جوزف اور مسز ماس کے عجیب و غریب نام دے دیئے ہیں جو ہماری شناخت کو ختم کر رہے ہیں۔"

سنٹ آرکٹک میں جہاں اسی قبیلہ کے لوگ رہتے تھے اور جن کا کلچر 1920ء سے منظم

طریقہ سے ختم کیا جا رہا ہے' ان میں سے بہت سوں کو اب اپنے انوئٹ ہونے کے بارے میں پتہ تک نہیں۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے' مقامی باشندے الاسکا میں پیداواری ذرائع پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ گرین لینڈ کے انوئٹ ڈنمارک سے مکمل خود مختاری کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یورینیم کی کانوں پر قبضہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ کینیڈا کی وفاقی حکومت نے شمال مشرقی علاقہ ڈینے (DENE) اور انوئٹ کو اجازت دیدی ہے کہ وہ دو نئے صوبے بنا کر ان میں خود مختار اقتدار کے ساتھ حکومت کریں۔

اس علاقہ میں میٹس (METIS) بھی زمین کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ انڈین اور سفید لوگوں کی مخلوط نسل ہیں۔ ان کے لیڈر لوئی ریل (LOUIS RIEL) نے انیسویں صدی میں حکومت کے خلاف ایک بغاوت کی سربراہی کی تھی۔ اس سے اس بات کا بھی اعلان ہوتا ہے کہ ایسے علاقوں میں جہاں کم آبادی تھی اور فطری ذرائع بھی کم تھے' وہاں جو لوگ آباد ہوئے انہوں نے نسلی تفریق کو روک دیا اور مقامی آبادی میں گھل مل گئے۔

اب تو آبادیاتی نظام ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے' اور اس کی جگہ اب پہلے سے زیادہ طاقتور قوتیں وجود میں آ گئی ہیں جنہوں نے تیسری دنیا کو غیر ترقی یافتہ بنائے رکھا ہے۔ اب بھی مقامی باشندوں کے ذرائع پیداوار پر قبضہ ہو رہا ہے اور ان کی روحانی زندگی اور کلچر میں برابر مداخلت کی جا رہی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اب تک مقامی لوگوں کے شعور اور ان کے ذہن کی لچک کو پوری طرح سے نہیں سمجھا گیا مثلاً گوئٹے مالا کے مایا اور مشرقی تیمور کے باشندوں کے ساتھ مسلسل نسلی تعصب برتا جا رہا ہے (اسی طرح جیسے آسٹریلیا و نیوزی لینڈ کے مقامی باشندوں کے ساتھ ماضی میں ہوا تھا) ہم جان ٹروڈیل ایک امریکی ریڈ انڈین کے الفاظ کے ساتھ یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔

> "1980ء کی دہائی میں ہم مزاحمت اور شعور کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو جرأت و طاقت پیدا کر جائیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "ہم تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ہمیں کچل دو۔" ہمیں انسانی حقوق سے بھی آگے جانا ہے' ہمیں شہری حقوق کو بھی پار کرنا ہے' اور پھر فطری حقوق کو پانا ہے کیونکہ تمام فطری دنیا کا یہ حق ہے کہ وہ زندہ رہے۔"

کلچرل امپیریلزم

رابرٹ سیل

میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع ہی میں ان دو الفاظ کی تشریح کر دوں جو میں اس مضمون میں استعمال کرنے والا ہوں۔ یعنی کلچرل اور امپیریلزم۔

امپیریلزم کی اصطلاح میں ان معنوں میں استعمال کرنا چاہتا ہوں کہ ایک نسل یا قوم کے لوگ جو سیاسی و معاشی طور پر طاقت ور ہوں، دوسری نسل یا قوم پر جو سیاسی و معاشی طور پر کمزور ہو اس پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیں (یہاں سیاسی و معاشی طور پر کمزور یا طاقت ور ہونے کو اضافی سمجھا جائے۔) طاقت ور اقوام کا کمزور اقوام پر اثر و غلبہ کا ذکر تاریخ کی کتابوں، نوآبادیاتی جنگوں یا آزادی کی جنگوں کے حوالے سے آتا ہے یا جب ہم ہندوستانی ایمپائر، امریکی نوآبادیات، کامن ویلتھ اور فرانسیسی ایمپائر کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں، تو اس سے طاقت ور کا کمزور پر قبضہ ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن میں جن معنوں میں اس اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتا ہوں وہ دو کلچروں کا تصادم ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے اور اسے سچ بھی قبول کر لیا جاتا ہے کہ یورپ کا کلچر ٹیکنالوجی اور سیاسی اداروں کی وجہ سے مستحکم ہے، لہٰذا یہ کلچر دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں افضل ہے۔ جو ملک کلچر کے لحاظ سے کمتر ہیں انہیں عام طور سے "ترقی پذیر" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس ہماری جیسی ٹیکنالوجی اور سیاسی ادارے نہیں ہیں۔ حقیقت میں کلچر کی برتری اور کمتری کا یہ تصور جدید ہے کیونکہ رومی جو سیاسی و معاشی لحاظ سے یونانیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مستحکم تھے مگر وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ یونانی کلچر ان کے مقابلہ میں زیادہ برتر ہے۔ اسی طرح غیر مہذب قبائل نے، جیسا کہ انہیں کہا جاتا ہے، اور جنہوں نے رومی سلطنت کو ختم کر دیا تھا، وہ اس بات کو مانتے تھے کہ انہوں نے رومی کلچر سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ لہٰذا کلچر کی برتری کا یہ تصور بالکل جدید اور ہمارے دور کی پیداوار ہے۔ آگے چل کر میں اس پر مزید روشنی ڈالوں گا۔

جب میں کلچر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو یہ ان محدود معنوں میں نہیں جو پچھلی کے دن

میوزیم یا گیلری میں دیکھا جاتا ہو، بلکہ ان وسیع معنوں میں ہے جو لوگوں کے ذہن کی غمازی کرتا ہو۔ لہٰذا میں زبان، تعلیم اور مابعد الطبیعاتی مسائل اور مذہب کی روشنی میں اس کی تشریح کروں گا۔ ثقافت کی بہت عمدہ تعریف ایک امریکی ماہر بشریات ایڈورڈ ہال کی ہے جو شاید آپ نے کہیں پڑھی ہو۔ وہ آسان زبان میں کہتا ہے کہ "کلچر تبادلہ خیال ہے" یعنی لوگ اپنے کلچر کے ذریعہ اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ میں اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس کے ذریعے لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ بھی کیا جاتا ہے۔

قوموں کے ساتھ ساتھ امپیریلزم کی شکل بھی بدلتی رہی ہے۔ اس لئے میں ہسپانوی، پرتگیزی، ولندیزی اور روسی امپیریلزم کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اپنی توجہ یہاں صرف اینگلو سیکسن امپیریلزم پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ اس دائرے میں برطانوی اور امریکی آتے ہیں اور کسی حد تک فرانسیسی بھی۔ دونوں نے ایک ہی عہد میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ میں اس کی ابتدا شمالی امریکہ میں برطانوی اور فرانسیسی کلچروں کے اثرات سے کروں گا، جو وہاں کے مقامی باشندوں پر ہوئے۔ اس کے بعد میں ان اثرات کی نشاندہی کروں گا جو برصغیر ہندوستان میں ہندوستانیوں پر ہوئے اور آخر میں مختصراً افریقہ کے بارے میں کچھ کہوں گا اور اس بات کا بھی جائزہ لوں گا کہ کیا کلچرل امپیریلزم ختم ہو چکا ہے یا یہ کسی دوسری شکل میں نمودار ہوا ہے۔

اب میں اس تاریخی پس منظر کی طرف آتا ہوں کہ یورپی اقوام کیوں غیر یورپی کلچر کو حقیر سمجھتی ہیں؟ اس رجحان کو ایک ہم عصر فرانسیسی مصنف نے بڑی خوبی کے ساتھ ایک جملہ میں ادا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ

> "یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ کچھ دانشوروں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے کلچر کو یورپی کلچر کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔"

یہ بہت ہی مغرورانہ الفاظ ہیں کہ جن کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تاریخی کلاسیکل دور میں سوچنے کا یہ انداز نہیں تھا کہ جن اقوام نے دوسروں پر فتح حاصل کر لی ہے تو محض اس وجہ سے ان کا کلچر افضل ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ سے ملتی ہیں مثلاً یورپ کی نشاۃ ثانیہ، جس نے فکر کی بہت سی جہتوں کو روشن کیا۔ یہ یونانی و رومی تہذیبوں کے اثرات، جو کہ قرون وسطیٰ کی اسلامی تہذیب میں محفوظ رہیں، پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی میں "خرد افروزی" کا دور آیا تو اس میں بھی اپنے نظریات و خیالات کی وجہ سے اسلامی کلچر سے علیحدہ رہا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی، اور یہ تصور مقبول ہوا کہ تمام انسانوں میں عقل یکساں طور پر موجود ہے اور یہ تمام دنیا میں، اور تاریخ کے ہر دور میں یہاں تک کہ

عیسائیت سے پہلے بھی' لوگوں میں موجود تھی' لہٰذا غیر یورپی اقوام کے کلچر میں دلچسپی لینا چاہیے اور ان کے لئے رواداری کے جذبات رکھنا چاہئیں۔ اس کے نتیجہ میں اس دور میں غیر عیسائی افکار اور روایات اور غیر یورپی ثقافتوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ خاص طور سے قدیم دور کی ثقافتوں میں۔

دلچسپی کا یہ رجحان بست صدی کے ساتھ فرانسیسی فلاسفروں کی فکر میں جھلکتا ہے مثلاً روسو کے ویدکس کے نظریات کے مطابق امریکہ کے ریڈ انڈین اور چین کا معاشرہ مقابلہ ۱۸ویں صدی کے یورپی معاشرہ اور ان کی آمرانہ حکومتوں کے پاکیزہ اور اچھا تھا۔ ایک اور دوسرے فرانسیسی مصنف لیبروئر (LABRUYERE) نے کہا کہ "فکر اور عقل کا تعلق تمام اقوام سے ہے۔" انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یورپی اقوام کو دور دراز ملکوں کی تہذیب و ثقافت میں دلچسپی لینا چاہیے۔ ان فرانسیسی مفکروں کے نزدیک شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین نسبتاً" زیادہ خوش اور روشن خیال وحشی ہیں (جیسا کہ وہ انہیں کہتے ہیں) اس لئے اہل یورپ کو ان کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اس سے "شریف انڈین" کا تصور پیدا ہوا جو بعد میں امریکیوں کے ذہن میں مسخ صورت میں پیدا ہوا تھا (HIAWA THA) اور پھر بعد میں "کاؤ بوائے اور انڈین" کی شکل میں گیا۔ فرانسیسیوں نے اس نقطہ نظر کو اس لئے اختیار کیا کہ وہ شمالی امریکہ میں آباد کاروں کی حیثیت سے نہیں آئے تھے بلکہ ان کا مقصد یہاں سیاحت اور شکار تھا۔ اس لئے ریڈ انڈین انہیں اچھے اور کام کے لوگ لگے۔ انہوں نے صرف ان کی معاشرتی زندگی میں دلچسپی لی کہ وہ کس طرح گزر اوقات کرتے ہیں' کیا سوچتے ہیں اور کس طرح رہتے ہیں؟

اس کے برعکس برطانوی "بے ہاتھ" اور "جیمس ٹاؤن" میں بحیثیت آباد کار آئے تھے اس لئے انہیں یہاں زمین اور زمین پر کام کرنے والے چاہئیں تھے۔ انہوں نے اول تو ریڈ انڈین کو خانہ بدوش سمجھ کر ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا مگر جب انہوں نے ان کی زمینوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا تو اس صورت میں وہ نیگروز کو بحیثیت غلام لے آئے۔ دیکھا جائے تو امریکی براعظم میں اہل برطانیہ پہلے نیگروز کو غلاموں کی حیثیت سے لانے والے نہیں' ان سے پہلے ۱۵ویں صدی میں جزائر غرب الہند میں ہسپانوی نیگروز کو لا چکے تھے۔ میں غلامی کے موضوع پر زور نہیں دوں گا کیونکہ اس صورت میں دونوں طرف سب سے کم اثرات ہوتے ہیں' طاقت ور کمزور کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرتا ہے اور انسانی تعلقات کی نوعیت بہت مکروہ ہو جاتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ۱۸ویں صدی نسبتاً" روشن خیالی کی صدی تھی تو پھر

اس دور میں غلامی کو کیوں برداشت کیا گیا؟ میرا خیال ہے کہ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اول یورپی لوگوں کی نگاہوں میں کالے اور سفید دو انتہائی بڑے تعصبات تھے۔ خاص طور سے افریقہ کے نیگروز' جنہیں وہ خود سے بہت مختلف سمجھتے تھے۔ دوم' جسے میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں کہ یہ نیگرو غلام جو جزائر غرب الہند میں گنے کے کھیتوں اور امریکہ کے جنوب میں کپاس و تمباکو کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے لائے گئے تھے یورپی و سفید اقوام کی معیشت کے لئے اہم ضرورت بن گئے تھے۔ یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ سفید لوگوں کے ثقافتی معیار اور معیار زندگی کو بلند برقرار رکھنے کے لئے' کالے لوگوں کو کسی بھی قسم کے مواقع نہیں دیے جائیں اور ان کا معیار زندگی پست رکھا جائے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ کے نیگرو' ریڈ انڈین کے مقابلہ میں زیادہ بہتر رہے' کیونکہ جب امریکہ میں "مقدر کے اظہار" (MANIFEST DESTINY) کا نظریہ پیدا ہوا تو اس کی زد میں آکر ریڈ انڈین یا تو ختم ہو گئے یا ان کو محفوظ علاقوں میں دھکیل دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی ان کے بارے میں "شریف ریڈ انڈین" کا تصور بھی ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ وہ خون آشام اور بے رحم بن کر ابھرے جن کو "کاؤ بوائے اور انڈین" کی شکل میں آج تک ٹی۔ وی پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں جن خیالات کو پھیلایا گیا وہ یہ تھے کہ 'انڈین سست' نشہ باز اور بیکار لوگ تھے۔ ان کے بارے میں یہ تصور قبول کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ 'ریڈ انڈین نشہ اس لئے کرنے لگا کیونکہ سفید آدمی نے اسے سستی شراب فروخت کی اور وہ سست و کاہل اس لئے بن گیا کہ اس سے اس کی زمین چھین لی گئی۔ جب طاقتور نے کمزور کے بارے میں اس خیال کو اس لئے پھیلایا تاکہ اس ذریعہ سے وہ معاشی منافع حاصل کرے تو ایسی صورت میں حقیقت کو سامنے لانا اور مشکل ہو گیا۔

حقیقت میں اگر دونوں کلچروں کے درمیان کوئی حقیقی رابطہ ہوتا تو اس صورت میں سفید آدمی' ریڈ انڈین سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ مثلاً سفید آدمی میں فطرت کے بارے میں احترام کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ سیکھ سکتا تھا کہ فطرت کی دولت کو کس طرح محفوظ کیا جائے۔ ڈوگلا جائیں پیلو انڈین لکڑی کے ہل استعمال کرتے تھے' سفید آدمی نے اس کے استعمال کو ترک کر کے اسے ریت کا میدان بنا دیا۔ ریڈ انڈین (گریٹ لیک) میں مچھلیاں پکڑتے تھے اور اس پر گزر بسر کرتے تھے' اس میں سفید آدمی نے صنعتی فضلہ پھینک کر اسے اس قدر زہر آلود کر دیا' کہ اس میں اب کوئی مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔

سفید فام ریڈ انڈین سے آباؤاجداد کا احترام سیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے بجائے امریکیوں

میں ماضی کے بارے میں حقارت آمیز رویہ پیدا ہوا۔ انہوں نے نوجوانی کی پرستش شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کثیر تعداد میں جو مہاجرین یہاں آکر آباد ہوئے' ان کے بچوں نے امریکی اسکولوں میں تعلیم پا کر انگریزی بولنا شروع کر دی' اور اپنے ماں باپ کو جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے تھے' کمتر سمجھنا شروع کر دیا' کیونکہ بوڑھے لوگ چونکہ آبائی ملکوں کی روایات سے وابستہ تھے اس لئے نئی نسل میں ان کے لئے کوئی احترام پیدا نہیں ہوا۔

سفید آدمی' ریڈ انڈین کی بہادری اور سخاوت کی خوبیاں حاصل کر سکتا تھا مگر اس کے بجائے انہوں نے جلدی سے امیر ہونا اور دولت مند معاشرے کا ایک حصہ بننا چاہا۔ ایک امریکی' ماہر علم بشریات' ریڈ انڈین کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ان میں آدمی کی عزت اس بات پر کی جاتی تھی کہ اس نے کیا دیا' اس پر نہیں کہ اس کے پاس کیا ہے۔" یہ سچ ہے کہ کلچر کے تبادلہ کی صورت میں ریڈ انڈین نے سفید آدمی سے گھوڑا لیا' جو دیکھا جائے تو ان کے لئے زیادہ فائدہ مند نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خسرہ جیسی بیماریاں' مہلک ہتھیار' شراب اور صنعتی معاشرہ کی بہت سی برائیاں سیکھیں۔

اس کے بعد میں ایشیا کی طرف توجہ دوں گا۔ اہل برطانیہ شمالی امریکہ میں آباد ہونے کی غرض سے گئے تھے' لیکن ہندوستان میں وہ تجارت کی غرض سے آئے تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے ابتداء میں ہندوستانی معاشرہ کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی' اور نہ ہی انہوں نے یورپی مذہب اور کلچر کو یہاں کے لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی' بلکہ ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں عربی و فارسی زبانوں و مشرقی علوم کا ایک کالج کھولا۔ اس کے ایک جانشین لارڈ کارنوالس (یہ وہی صاحب ہیں جنہیں امریکہ کی آزادی کے سلسلہ میں یارک ٹاؤن میں شکست ہوئی تھی) نے بنارس میں سنسکرت کے لئے ایک کالج کھولا۔ 18 ویں صدی میں' جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' اجنبی اور غیر کلچر کے مطالعہ اور اس کو جاننے کا شوق تھا۔ اس کی کئی مثالیں ہیں مثلاً سر ولیم چیمبرز نے کیو گارڈن میں ایک پگوڈا تعمیر کیا تھا' جو اب تک موجود ہے (جارج چہارم نے برائٹن میں ایک پویلین بنوایا تھا' جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "وہ باہر سے نیم چینی لگتا اور اندر سے ہندو لگتی ہے" جب اٹھارویں صدی کے آخر سال میں نپولین مصر گیا تو وہ اپنے ہمراہ ماہر تعمیرات اور نقشہ نویس بھی لے گیا تھا تاکہ وہ وہاں کی قدیم عمارتوں کا مطالعہ کر سکیں۔ اس نے تمام یورپ میں ROSETTA پتھروں کی تحریر کو تشہیر کرایا تاکہ یورپ کے علماء اسے پڑھ سکیں اور اس کی یہ خواہش پوری بھی ہو گئی' نپولین اکثر کہا کرتا تھا کہ "اگرچہ اس نے اس پر عمل نہیں کیا' حقیقی فتح جو کسی تاسف کو پیدا نہیں کرتی' وہ جہالت پر فتح

ہے۔"

ہندوستان میں اتنی اچھی ابتدا کے بعد' آخر یہ سب کیوں بگڑ گیا؟ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے برطانوی اقتدار ہندوستان میں پھیلا' ایسے ایسے انتظامی مسائل پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔ کارنوالس کا یہ خیال تھا کہ ہر ہندوستانی بے ایمان ہے۔ اس لئے ہندوستان کے انتظامی اداروں کو انگریزی طرز پر ڈھالا جائے۔ اس سوچ کے نتیجہ میں 1806ء میں ایسٹ انڈیا کالج جو بعد میں ہیلی بری کالج کہلایا' اس نے انڈین سول سروس کی تربیت کی۔ اس کے علاوہ یہ ہوا کہ 1813ء میں عیسائی مشنریوں کو ہندوستان میں داخلہ کی اجازت مل گئی اور انہوں نے کافروں کو نہ صرف عیسائی بنانا چاہا' بلکہ ان کی طرز زندگی کو بھی بدلنا چاہا کیونکہ وہ ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان جہاں مذہب زندگی کے ہر پہلو میں رچا بسا ہوا تھا' ایسے معاشرہ میں انگریزوں نے مذہب اور سیاست کی علیحدگی کی بات کی' کہ مذہب ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کا روز مرہ کے سیاسی معاملات اور معاشی مفادات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مدح اور مادی ترقی کا تصور بھی پیش کیا جو اہل ہندوستان کے لئے اجنبی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے بینتھم کے نظریہ افادیت کی تبلیغ کی' اس کے تحت خوش حالی مسرت کا باعث ہوتی ہے' اور اس کا انحصار معاشی ترقی اور اعلیٰ تعلیم پر ہے۔ لہذا اہل برطانیہ نے افادیت پرستی اور مذہب کے زیر اثر' ہندوستان میں اپنی حیثیت ایک ایسے مبلغ کی کر لی' جن کا یہ فرض تھا کہ وہ محکوم لوگوں کے کلچر اور ان کے طرز زندگی کو تبدیل کر کے' انہیں یورپی بنا دیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں یورپی کلچر سب سے زیادہ افضل تھا۔ انتظامیہ کے عہدیدار جن کے لئے تجارت ممنوع کر دی گئی تھی' انہوں نے اس مشن کو پورا کرنے کی جدوجہد کی۔ یہ وہ دور ہے جسے ہم "سفید آدمی کے بوجھ" کا دور کہتے ہیں۔

گورنر جنرل ولیم بینٹنک (1828-1835ء) کے زمانہ میں یہ فرق واضح ہو گیا۔ اس زمانہ میں یہ دو آدمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں" لارڈ میکالے اور جیمس مل' جو انڈیا آفس میں ملازم تھا اور اسے عقل پرستی کا امام اور "افادیت پرست" کہا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا مگر اس نے ہندوستان کی تاریخ پر کئی جلدوں میں ضخیم کتاب لکھی۔ ان دونوں نے ہندوستان میں برطانوی منتظمین کو ذاتی طور پر متاثر کیا۔

بینٹنک کہا کرتا تھا کہ "انگریزی زبان تمام ترقی کی کنجی ہے۔" اس لئے فارسی زبان جو عدالتی زبان تھی' اسے ہٹا کر انگریزی کو رائج کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دور شروع ہوا کہ جب انڈین سول سروس کے لوگوں نے ہندوستانی کلچر میں دلچسپی لینا آہستہ آہستہ ختم کر دی۔ بینٹنک

کہا کرتا تھا کہ "تعلیم کے ذریعہ ہندوستان کو دوبارہ سے زندگی دی جا سکتی ہے۔" لیکن اس نے اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں جو فارسی اور سنسکرت کی سرپرستی کرتے تھے' آمدہ سے تمام تعلیمی فنڈ انگریزی زبان کے فروغ اور یورپی سائنس کے لئے وقف کر دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے اہل ہندوستان خوشحال ہوں گے اور پر مسرت زندگی گزاریں گے۔ لیکن بدقسمتی سے بگڑ کے یہ رابطے زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوئے۔ یہاں میں صرف قانون کی مثال دوں گا۔ میکالے خود کہا کرتا تھا کہ ہندوستانی انگریزی قوانین سے ناواقف ہیں۔ یہ بات اس نے وارن ہیسٹنگز پر مضمون لکھتے ہوئے کی تھی۔

"کسی کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ ان اجنبی عدالتوں سے کیا ظہور میں آئے گا؟ یہ ان ججوں پر مشتمل ہوتی تھیں' جو ان لاکھوں انسانوں پر' جن پر انہیں کنٹرول تھا' ان کی روایات سے ناواقف تھے۔ عدالتی کارروائی ایک اجنبی زبان میں ہوا کرتی تھی' سزائیں اجنبی زبان و لہجہ میں سنائی جاتی تھیں۔ اس کے نتیجہ میں عدالتوں میں مقامی لوگوں کے بدترین اشخاص جمع ہو گئے ہیں جن میں مخبر' جھوٹی شہادتیں دینے والے' عادی مقدمہ باز' فریبی اور لٹیرے اہل کاروں کی ایک فوج ہے۔"

اہل برطانیہ نے ہندوستانیوں میں کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا' جب کہ ہندوستانی فلسفہ میں جس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی خواہش مت پیدا کرو۔ لیکن اہل برطانیہ نے ان سے یہ نہیں سیکھا۔ اس کا اندازہ آپ کو جیمس مل کے لڑکے جان سٹیورٹ مل کی زندگی سے ہو جائے گا۔ اسٹیورٹ مل ہندوستانی فلسفہ اور مذہب کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ وہ افادیت کے نظریہ کے زیر اثر اپنی ابتدائی زندگی میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ زیادہ مسرت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیمی اور معاشی اصلاحات کی جائیں۔ اس میں ترقی و کامیابی پوشیدہ ہے۔ مگر 1826ء میں وہ مایوسی اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا کہ "ان حالات میں مجھے یہ خیال آیا کہ میں خود سے یہ سوال کروں کہ فرض کرو' اگر انسان کے تمام مقاصد اس دنیا میں پورے ہو جائیں' اور ان تمام اداروں' روایات و اقدار میں جس تبدیلی کا تو خواہش مند ہے' وہ آ جائے' تو کیا یہ تمہارے لئے خوشی و مسرت کا باعث ہو گا؟ اس پر میرے تحت الشعور سے ایک ناقابل مزاحمت جذبہ نے جواب دیا کہ "نہیں" اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ وہ بنیاد کہ جس پر میری پوری زندگی کا انحصار تھا وہ ڈھ گئی۔ میری تمام خوشی جو انجام کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے لئے وقف تھی' اب اس انجام میں مجھے کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ اب میں کس طرح سے

دوبارہ ان حالات میں دلچسپی لوں' ایسا نظر آتا ہے کہ میرے لئے زندہ رہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔"

یہ جگر خراش تجربات بھی مل کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکے کہ وہ اس کی تحقیق کرتا کہ یورپی کلچر سے علیحدہ' دور' مختلف آب و ہوا اور مختلف طرز زندگی کا ایک اور کلچر ہے' اور اس میں شاید اس کے مسائل کے بارے میں کچھ کہا گیا ہو اور اس میں شاید اس کے ذہنی دباؤ کا علاج ہو۔

انیسویں صدی میں امپیریلزم اور تیز ہو گیا جسے دو مسلک نظریات نے شدید بنا دیا۔ ان میں سے ایک ڈارون کا نظریہ تھا جسے اس شکل میں' جیسا کہ اس نے پیش کیا تھا' تسلیم نہیں کیا گیا' بلکہ اسے اس طرح سے پیش کیا گیا کہ جو سخت ترین سختیوں کو برداشت کر لیتا ہے وہ مضبوط اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں طاقت ور کا مطلب تھا کہ جن کے پاس بہت سی بندوقیں ہیں اور جو ان کی مدد سے حکومت کرتے ہیں۔ ان کا حق ہے کہ وہ کمزوروں کو اپنے تحت میں رکھیں کیونکہ یہ فطرت کا اصول ہے۔

دوسرا نظریہ نسل پرستی کا تھا جسے پہلے ایک فرانسیسی سفارت کار گوبینے (GOBINEAU) نے پیش کیا' بعد میں ایک انگریز مفکر اسٹیوارٹ چیمبرلن' نے جس نے رچرڈ واگنر کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور جرمنی میں جا کر رہنے لگا تھا' اسے مزید ابھارا۔ نسل پرستوں کے نظریات نے ڈارون کے خیالات کو مسخ کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ نسل کا خالص ہونا' انتہائی اہم چیز ہے۔ اس کی مثال انہوں نے گرے ہاؤنڈ اور ریس کے گھوڑوں سے دی۔ اگر ایک خالص نسل پیدا کی جائے تو یہ انتہائی طاقت ور اور زندہ رہنے کی اہل ہو گی۔ ان کے ذہن میں یہ بہترین نسل ٹیوٹن' اور اینگلو سیکسن تھی۔ ان کے درجات کے مطابق یہودی اور نیگرو سب سے نچلے درجہ میں تھے۔

بدقسمتی سے یہ نظریات اس وقت فیشن میں تھے جب کہ برطانوی اور فرانسیسی افریقہ میں اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے اور جب کہ غدر کے بعد برطانوی حکومت ہندوستان میں طاقت ور ہو گئی تھی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے' شاید اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو' لہٰذا میں میکالے کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو نسل پرستی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میکالے نے ایک بنگالی نثر نگار کے بارے میں تمسخر اور حقارت کے ساتھ کہا کہ "انگریزوں کے لئے جو حیثیت طالویوں کی ہے اور اطالویوں کے لئے جو حیثیت ہندوؤں کی ہے اور ہندوؤں کے لئے جو حیثیت بنگالیوں کی ہے' وہی حیثیت نثر نگار کی بنگالیوں کی نظر میں ہے۔۔۔ بنگالیوں کی جسمانی حالت کمزور

رنا رک ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان میں نسوانیت ہے۔ ان کے تمام مشاغل بیکار ہوتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات سست ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن بھی ان کے جسم سے مشابہت رکھتا ہے' بڑا کمزور ہے۔ یہ مردانہ مزاحمت کے لئے بیکار ہے۔ اس لئے اس کمزور ماحول میں جو لوگ سختی برداشت کرتے ہیں اور طاقت ور ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کیا جاتا ہے' اور یہ لوگ ان کے لئے سوائے حقارت کے اور کچھ نہیں رکھتے۔ لمبے چوڑے وعدے' اچھے بہانے' پیچیدہ و الجھے ہوئے جھوٹ کے گڑھنے بنانے' دھوکہ دہی' دروغ حلفی' ان کے وہ ہتھیار ہیں جو یہ اپنے دفاع اور حملے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ گنگا کے زیریں علاقے میں رہنے والے لوگوں کی عادت ہے۔" اس کا لب و لہجہ ایسا ہی ہے جیسا کہ برطانوی پبلک سکول کا ہیڈ ماسٹر' ان بچوں کی رپورٹ لکھ رہا ہو جو اچھے کھلاڑی نہیں ہیں۔

میں کسی طرح بھی ہندوستان میں برطانیہ کے حقیقی کارناموں کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے ہندوستان میں بندرگاہیں' شاہراہیں' پل اور ہسپتال تعمیر کرائے جو آج تک موجود ہیں لیکن ان میں' اور ہندوستانیوں میں خیالات کا کوئی مفید تبادلہ نہیں ہوا' اور نہ ان میں ایک دوسرے کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اہل برطانیہ نے دراصل اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ ہندوستان میں ان کی کامیابی' ان کی نسلی برتری کی وجہ نہیں' بلکہ ان کی ٹیکنالوجی کی ترقی' اور ہندوستانی معاشرہ کی کمزوری کی وجہ سے ہوئی جو ذات پات اور مذہب کی بنیادوں پر تقسیم تھا۔ میں ایک بار پھر ایک اور مستعمر جان لارنس آف پنجاب کی رائے بیان کروں گا' جس نے 1858ء میں کہا تھا کہ "ہم یہاں عوام کی مرضی یا ان کے انتخاب سے نہیں آئے ہیں بلکہ ہم اپنی اخلاقی برتری' حالات کی موافقت اور مشیت ایزدی کی مرضی کے سبب طاقت میں آئے ہیں اور یہ وہ چارٹر ہے کہ جس کی بنیاد پر ہم ہندوستان میں حکومت کر رہے ہیں۔"

وکٹوریہ کے عہد کے ایک مدبر چارلس ڈلک (DILK) نے برطانوی سلطنت کی سیاحت کے بعد لکھا کہ "میرے پورے سفر کے دوران جو خیال میرے ساتھ ساتھ رہا' اور جس نے میری راہنمائی کی' اور وہ چابی جس نے پر اسرار اور نئی سرزمینوں کے مخفی خزانوں کو ہمارے لئے کھولا وہ ہماری نسل کی شان و شوکت کا تصور تھا جو کہ تقریباً ساری دنیا کو اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ یہ اس کے مقدر میں تھا کہ وہ چاروں طرف پھیل جائے" ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برتری کے تصور نے اسے تقریباً اندھا کر دیا ہے اور اسے نئی سرزمینوں میں کوئی فکر اور سوچ ہی نظر نہیں آئی جسے وہ سمجھ سکتا۔

یہ زمانہ سفید آدمی کے بوجھ کا زمانہ تھا' امریکہ میں اسی خیال نے مقدر کے اظہار کی شکل

اختیار کر لی تھی اور یہی وہ خیالات تھے کہ جب فرانسیسیوں نے افریقہ میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ فرانسیسیوں کو خصوصیت سے ایک خاص مسئلہ کا سامنا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام کے وارث تھے اور جو نوآبادیات کو اپنی معاشی ضروریات کے تحت ضروری خیال کرتے تھے بلکہ وہ فرانسیسی انقلاب کے بھی وارث تھے۔ اور اس طرح مساوات' اخوت اور آزادی پر یقین رکھتے تھے۔ اس ناتا سے کالا کوئی ان کا بھائی ہو؟ تھا' لیکن وہ خود کو بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس مشن کے تحت کام کیا کہ ایک فرانسیسی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ وہ کالے آدمی کو جہاں تک ہو سکے' فرانسیسی بنا دے۔ لہذا افریقی دو مختلف قسم کے کلچروں میں پروان چڑھے۔ گھر دریا کے ایک طرف انگریزی زدہ بچے انگریزی میں پہاڑے یاد کر رہے ہوتے' جب کہ دوسری جانب فرانسیسی زدہ بچے' راسین کو یاد کر رہے ہوتے تھے۔

تاریخ کے اس مختصر بیان کے بعد' اب ذرا دور حاضر کو دیکھا جائے۔ کیا ماضی میں جو کچھ ہوا تھا وہ تبدیل ہو گیا ہے؟ کیا ہم نے امپیریلزم کے ساز و سامان کو تباہ کر دیا ہے؟ یا امپیریلزم انہی مقاصد کو اب مختلف اور زیادہ اچھے طریقوں سے حاصل کر رہا ہے؟ سابقہ نوآبادیاتی طاقتیں اب خود کو اصلاح شدہ سمجھتی ہیں' اور ایسا ٹھیک بھی نظر آتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی نوآبادیوں کو آزادی دے دی ہے اور انہیں فنی و مالی امداد بھی مہیا کر رہے ہیں لیکن کیا حقیقت میں وہ آزاد ہیں؟ دراصل ان ملکوں کے لئے پرانے انداز میں حکومت کرنا مشکل ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے جدید ہتھیار استعمال کئے۔ یعنی اگر قدیم نوآبادیات میں یہ بھوک پیدا کر دی جائے کہ ان کی تسکین صرف مغربی ٹیکنالوجی کے ذریعہ پوری ہو گی تو اس شکل میں پھر سے انہیں اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس امداد کا واحد مقصد ان ملکوں میں معیار زندگی بلند کرنا ہے تو یہ پیسہ اقوام متحدہ اور ایسی ہی دوسری ایجنسیوں کو کیوں نہیں دے دیا جاتا' جو اس امداد کو بہتر طریقہ سے تقسیم کر سکیں گی۔ برطانیہ اور فرانس' اس رقم سے جو وہ اقوام متحدہ کو بطور چندہ دیتے ہیں۔ دس گنی رقم امداد کے طور پر مختلف ملکوں کو دیتے ہیں۔ اس میں برطانیہ کی یہ شرط ہوتی ہے کہ 65 فیصد امدادی رقم سے ان کی اشیاء خریدی جائیں گی۔ تقریباً 75 فیصد امداد یہ ان ملکوں کو دیتے ہیں' جو ان کی سابقہ نوآبادیاں تھیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے ہتھیار ہیں جو اب استعمال کئے جاتے ہیں؟ ان میں سے زبان سب سے اہم ہے' کیونکہ اگر کسی ملک کے تعلیمی اداروں کو چلایا جائے اور ان کے صحافتی مطبوعات کی نگرانی کی جائے تو ان پر آسانی سے اپنے خیالات و نظریات کو مسلط کیا جا سکتا ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

"کسی زبان کی معلومات کلچر پر اثر انداز ہوتی ہے' اور زبان کے ذریعے جس بات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ لوگوں کی روح تک پہنچ جاتی ہے۔"

اور حقیقت میں یہ سچ بھی ہے۔ ایک تیونس کے باشندے نے مجھ سے فرانسیسی اثر کے بارے میں کہا تھا کہ:

"انہوں نے میری روح کی گہرائیوں تک مجھے مہذب بنا دیا ہے۔"

یہ بات اس نے بڑی تلخی کے ساتھ کہی تھی۔

جب یونیسکو کی کسی مجلس میں فرانسیسی اور انگریزی بولنے والے افریقی تقریر کرتے ہیں تو فوراً ہی فرانسیسی اور انگریزی کلچر کے نمائندوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی بولنے والے افریقی فصاحت و بلاغت اور منطقی انداز میں بولتے ہیں' جب کہ انگریزی بولنے والے فصاحت کے ساتھ مزاحیہ فقروں اور جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ یونیسکو کی اس بین الاقوامی تنظیم میں' جو 1945ء میں قائم ہوئی تھی' اور جس کا مقصد مساویانہ بنیادوں پر قوموں میں کلچر کا تبادلہ تھا' اس کی کارروائی چار زبانوں میں ہوتی تھی اور یہ چار زبانیں سامنے تھیں یعنی انگریزی' فرانسیسی' ہسپانوی اور روسی۔ اس کے قیام کے بعد اس کے ڈائریکٹر جنرلوں میں سے ایک انگریز' ایک امریکی ایک اطالوی' ایک فرانسیسی اور ایک میکسیکو کا ہوا۔ (مجھے علم نہیں کہ یہ کیسے ڈائریکٹر جنرل بن گیا) دراصل یہ یورپی کلچر کے پروپیگنڈے کی ایجنسی ہو گئی ہے۔ اس کا 80 فیصد بجٹ امریکہ' روس' جاپان اور 13 مغربی ممالک دیتے ہیں۔ اس میں سے یہ 73 فیصد بجٹ تعلیم' سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کرتی ہے۔ یونیسکو کے اندازہ کے مطابق 700 ملین لوگ ان پڑھ ہیں۔ اور پروگرام یہ ہے کہ ٹی وی' ریڈیو کے ذریعہ تعلیم کو پھیلایا جائے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ پروگرام مقامی زبانوں میں ہوں' لیکن اندازہ ہے کہ یہاں بھی یورپی زبانوں کو استعمال کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان پڑھ لوگ پروپیگنڈے کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور ٹی وی میں یا تو وہ باکسنگ کے مقابلے دیکھیں گے اور یا یورپی مزاحیہ پروگرام۔

افریقہ و ایشیاء میں بہت سے لوگ ہیں جو خود کو کلچر کے تحفظ کا شکار نہیں سمجھتے اور ہر یورپی چیز کو قبول کر لیتے ہیں جیسے کہ جاپانیوں نے کیا۔ انسان چونکہ کائنات کا مرکز ہے' اس لئے وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں یہاں یونیسکو کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے الفاظ مثال کے طور پر دوں گا جو انہوں نے 1947ء میں کہے تھے:

"ہمیں سب کو مل کر اس جاندار تعلیم پر عمل کرنا چاہئے جس میں تنقیدی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے' اور جس میں فکری و سائنسی تحقیق ہو' جو اس خیال پر مبنی ہو

کہ انسان اس کائنات کا محور ہے۔"

میں آخر میں اس بات کا تجزیہ کروں گا کہ یہ انسان اور مرکز کائنات کیا ہے؟ اور یہ نقطہ نظر ہمیں کہاں لے جائے گا' اور اس کی افادیت کو جانچنے کا پیمانہ کیا ہو گا؟ دراصل اس کا پس منظر عیسائیت کا نظریہ گناہ تھا' جس کے رد عمل میں 18 ویں صدی میں یہ خیال ابھرا کہ انسان اس دنیا میں کوئی بوجھ اور قرض لئے ہوئے پیدا نہیں ہوتا' بلکہ وہ اپنے بنیادی حقوق لئے دنیا میں آتا ہے۔ اس کا ذکر بڑے اچھے انداز میں امریکی اعلان نامہ آزادی میں ہے۔

"خدا تمام انسانوں کو بنیادی حقوق سے نوازتا ہے۔" زندگی' آزادی اور خوشی کے ذرائع ہر انسان کے حقوق ہیں اور خالق نے انہیں ان سے نوازا ہے۔ اگر انسان ان حقوق سے محروم ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کی غلطی ہے۔ جب انسان دکھ اٹھاتا ہے' ناانصافی کا شکار ہوتا ہے' بیمار ہوتا ہے' مفلسی کی اذیت برداشت کرتا ہے' بوڑھا ہوتا ہے اور مرتا ہے' تو وہ خدا کی شکایت کرتا ہے۔ لیکن جب سے انسان نے خدا پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے تو اب وہ زیادہ ریاست کی طاقت پر یقین کرنے لگا ہے' اس لئے آج جب ہم مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو ریاست کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ اسی سے فلاحی ریاست کا تصور ابھرا۔ اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ اگر صفائی کا انتظام ہو' کھانے پینے کی چیزوں کی بازار میں بہتات ہو اور چھٹیاں منانے کے لئے صحت افزاء مقامات پر جا سکتے ہوں تو انسان خوشی و مسرت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ایک امریکی ماہر نفسیات ایڈورڈ ٹی ہال یہ فرض کرتا ہے کہ مسرت وہ چیز ہے جس پر امریکہ کا تسلط ہے۔ وہ اپنی ایک کتاب میں اس کے ثبوت میں ایک انٹرویو دیتا ہے جو ایک امریکی پروفیسر نے ترکی میں کسانوں سے لیا تھا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں کہ خوشی بھی ایسی کوئی چیز ہے جس پر ان کا حق ہے اور اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا چاہئے۔ انٹرویو لینے والے کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں آئی کہ گاؤں والے اس کے مسرت کے نظریے کے بغیر زیادہ خوش اور مطمئن ہیں اور ان میں نہ تو لوازمات کی پرستش ہے' نہ دولت و طاقت کے حصول کی جدوجہد' نہ مفلسی' بڑھاپے اور موت کا خوف۔

ہم نے جن ملکوں میں اپنی تہذیب اور کلچر کو پھیلایا ہے وہاں ہم نے ان ملکوں کے معاشرتی ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ مسرت کا جو تصور ہمارا ہے وہ ایک اضافی تصور ہے اور یہ انفرادی و اجتماعی نقطہ نظر سے بدلتا رہتا ہے۔ ہمارا معاشرہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے اور اس میں ہر فرد اپنی مسرت کے حصول میں سرگرداں ہے اور اس لئے مسرت کے حصول کے لئے کوئی اجتماعی کوشش نہیں ہوتی۔ معاشرے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انفرادی رجحان اور مسلک

منفی اثرات کو' ہم نے ان معاشروں میں رائج کیا جن کی تنظیم دوسرے خطوط پر تھی' اور اہل مغرب انہیں پس ماندہ سمجھتے ہوئے ان کا تعلق تہذیب کے ابتدائی ادوار سے قائم کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی اثرات نے ان معاشروں کی جن کی بنیاد قبائل اور خاندان پر تھی' کوئی دوسرا متبادل نظام دیے بغیر' انہیں ختم کر دیا۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے یوگنڈا کے طالب علم سے بات کی جس نے مجھے بتایا کہ وہ ابتداء میں برطانوی معاشرہ سے سخت بیزار تھا کسی نسلی امتیاز کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کی سرد مہری کی وجہ سے' جن میں کوئی اجتماعی زندگی کا احساس نہیں' اور جن میں خاندان سے تعلق کے جذبات بھی ختم ہو رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ جب وہ اور اس کے دوست تعلیم کے بعد واپس گئے تو انہوں نے گھر میں بڑے خاندان کے لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا' ایک طرف اس کے ہاں اجتماعی زندگی کا تصور تھا' تو دوسری طرف مغرب کی انفرادیت اس میں رچ بس گئی تھی۔

آخر میں' میں یہ کہوں گا کہ ہم دوسرے معاشروں کے ماحول کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے تباہ کر رہے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال ایک ملین ٹن سلفرک ایسڈ سویڈن پر گرتا ہے جو کہ دوسرے صنعتی ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ صنعتی نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ وقت کے ساتھ اس سے زیادہ تیزابی افریقہ پر گرے گا۔ دوسرے براعظموں کے جو لوگ کم ترقی یافتہ ہیں وہ فطری ذرائع محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ فطرت کو قدرت کا مظہر سمجھتے ہیں۔ ایک مضمون میں' جسے کلیر سٹرلنگ (CLARE STIRLENG) نے سنڈے ٹائمز میں لکھا' اس کا عنوان تھا "عظیم اسوان کی حماقت" وہ لکھتی ہے کہ:

> " ہزار سال پہلے نیل کی وادی کے لوگ دوشیزاؤں کو ہر اگست کے مہینے میں دریا میں پھینکتے تھے تاکہ سیلاب کی دیوی خوش ہو جائے۔ اس ڈیم کے بننے تک' نیل کا سالانہ سیلاب مصر کے لئے فطرت کا شاندار تحفہ تھا۔"

اس نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ چونکہ مٹی اب ڈیم کی وجہ سے بہہ کر نکل نہیں سکتی ہے' اس لئے وہ علاقے جو اس مٹی کی وجہ سے پہلے زرخیز تھے' یا تو اب زرخیز نہیں رہے یا اب انہیں مصنوعی کھاد سے زرخیز کیا جا رہا ہے جس پر کافی رقم خرچ آتی ہے۔ اس وجہ سے مشرقی بحرروم کے علاقے متاثر ہو رہے ہیں اور نیل کا ڈیلٹا صاف پانی کی وجہ سے کٹ رہا ہے۔ اس طرح جو چیز ایک اچھے جذبہ سے نکالی گئی تھی' اب وہ یہ ظاہر کر رہی ہے کہ کس طرح تکنیکی غرور اور لاواقفیت کی بناء پر فطری تباہی کو دعوت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی کے انسان نے ہم سے زیادہ واقف مندی کا ثبوت دیا۔

لہٰذا اس مایوس کرنے والی کہانی کے آخر میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسانی رشتوں اور جاہلانہ خیالات میں مشرق' مشرق ہے اور مغرب اب تک مغرب ہے۔ اگرچہ ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں نے مغربی ٹیکنالوجی اور مغربی سیاسی فکر کو قبول کر لیا ہے اور آج سیٹلائٹ نے دنیا کے ملکوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے' اس لئے جب ہم چین کے سیٹلائٹ کا یہ پیغام سنتے ہیں کہ "مشرق سرخ ہے" تو دوسری طرف امریکی خلا نوردوں کو چاند کی سطح پر چہل قدمی کرتے دیکھتے ہیں' تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک سچ اور بھی ہے جو بڑا مشکل ہے مگر ساتھ ہی بڑا اہم بھی ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان کسی طرح اپنی فطرت و ذہنیت پر قابو پائے' اور اسے تبدیل کرے۔

آزادی اور نیو کلونیل ازم

آنکی ہوگ ویلٹ

آزادی اور نیو کلونیل ازم (NEO - COLONIALISM) نہ تو اوپر سے نازل ہوئے اور نہ اچانک وجود میں آئے۔ یہ ایک تاریخی دباؤ کے نتیجہ میں پیدا ہوئے اور ان کی جڑیں نو آبادیاتی نظام میں پوشیدہ تھیں' جس کی کامیابی نے مغربی یورپی طاقتوں کو یہ مواقع دیئے کہ وہ نو آبادیات کے ذرائع پیداوار کو کنٹرول کریں۔ اور ان ذرائع کو اپنی ترقی میں استعمال کریں۔ لیکن اسی عمل کے نتیجہ میں تضادات پیدا ہوئے اور ان ملکوں نے دولت و مراعات کو محفوظ رکھنے کیلئے حالات کو بدلنے کے ساتھ خود کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ یہی مارکسی تاریخ کی تفسیر میں انتہائی اہم نکتہ ہے کہ ہر تاریخی دور ذرائع پیداوار اور پیداواری قوتوں کے درمیان تصادم پیدا کرتا ہے۔ یہ تصادم سیاسی اور نظریاتی میدان میں بھی ہوتا ہے۔

یہاں ان تبدیلیوں اور تاریخی دباؤں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- عالمی معاشیات 2- عالمی سیاست 3- جیو پولیٹیکل حالت

نو آبادیاتی دور میں ذرائع پیداوار جس طرح زبردستی حاصل کر کے نو آبادیات کا استحصال کیا گیا اس کے نتیجہ میں دو اہم باتیں پیدا ہو گئیں۔

براہ راست سیاسی اقتدار کی وجہ سے معاشی ذرائع پر قبضہ ہو گیا۔ ان کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا اور اس کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئیں تھیں کہ براہ راست سیاسی اقتدار ختم کرنے کے بعد بھی ان کا معاشی اقتدار اسی طرح سے قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑے بڑے زرعی فارم ان کے قبضے میں تھے۔ جب یہ قبضہ ختم ہوا تو اس وقت تک زراعت کے پورے ڈھانچے کو بدلا جا چکا تھا اور کھیتوں میں ایسی فصلیں پیدا کی جا رہی تھیں جن کی ان کو ضرورت تھی۔ کانوں کی معدنیات کے ٹھیکے ان کے پاس تھے اور پھر ان پر میٹروپولیٹن فرموں کا قبضہ ہو گیا۔ اسی طرح امپورٹ' ایکسپورٹ اور عالمی منڈیاں ان فرموں کے قبضہ میں ہیں جن کی بین الاقوامی پوزیشن ہے جیسے یونائیٹڈ امریکن کمپنی' اور جان ہولٹ وغیرہ۔ اس وجہ سے نو آبادیات کی کل پیداوار ان کے قبضہ میں آگئی اور اس طرح "غیر ملکی کی جائیداد" کو بین الاقوامی قانون کے

تحت تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ اس صورت میں براہ راست سیاسی اقتدار کے بغیر بھی ان کا قبضہ ذرائع پیداوار پر رہا۔ یہ نیو کلونیل ازم کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ نو آبادیات میں یورپی اقوام نے اپنی ضروریات کے تحت انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ صرف خام مال پیدا کریں اور پھر اسے یورپی ملکوں کو برآمد کریں۔ اس کے بدلہ میں تبادلہ کے طور پر ان سے تیار شدہ صنعتی اشیاء خریدیں۔ اس معاملہ میں جو شرائط مقرر ہوئیں وہ یورپی ملکوں کے موافق تھیں اور یہی شرائط اور غیر مساوی تجارت نیو کلونیل ازم کا ایک انتہائی اہم ستون ہے۔

1950ء کی دہائی میں جب کہ بہت سی نو آبادیات آزاد ہو گئیں تو اس زمانہ میں یورپی ملکوں نے اپنی پالیسی کو تبدیل کیا اور خرچ ہونے والی اشیاء (CONSUMER GOODS) کی جگہ انہوں نے پیدا کرنے والی اشیاء (PRODUCERS GOODS) جیسے مشینیں' اوزار' پلانٹ اور انجینیئرنگ کے اوزار نئے آزاد ملکوں کو بھیجنا شروع کر دیئے۔ انہوں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ نو آبادیات میں آزاد ہونے کے بعد خرچ ہونے والی اشیاء جیسے کپڑا' ماچس اور سگرٹ کی مانگ نہیں رہے گی' اس لئے اب انہوں نے ان کا درجہ بڑھا کر انہیں ایک ایسی منڈی میں بدل دیا جنہیں کپڑا بنانے اور ماچس و سگرٹ بنانے کی مشینیں چاہئیں۔ کیونکہ نئے آزاد ملکوں میں زبردست خواہش تھی کہ وہ صنعتی ترقی میں مغرب کے برابر ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مغربی طریقوں کو اختیار کیا اور مغربی ملکوں نے ٹیکنالوجی کو منتقل کرنے کے ذریعے ان کے ذرائع پر اپنا کنٹرول برقرار رکھا۔ چونکہ ان ملکوں میں ٹیکنالوجی کی کمی تھی' اس لئے مغرب کی اجارہ داری قائم ہو گئی اور پھر ان کی سرمایہ کاری کی وجہ سے ملٹی نیشنل کمپنیاں وجود میں آگئیں۔ اب خام مال کے ذریعہ چیزیں انہیں ملکوں میں تیار کر کے وہیں فروخت کر دی جاتی ہیں۔

نو آبادیاتی دور میں سیاسی و سماجی طور پر ایک اور تضاد اس عمل سے پیدا ہوا کہ یورپی حکمرانوں نے اپنی پسند کے لوگوں کو منتخب کر کے انہیں تربیت دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ طبقہ حکمرانوں اور رعیت کے درمیان ترجمان کے فرائض سرانجام دے اور جیسا کہ میکالے کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں گے مگر اپنے ذوق' نظریات' ذہن اور مذاق کے اعتبار سے انگریز۔ انہیں صرف انگریزی لکھنے اور پڑھنے ہی کی تعلیم نہ دی گئی بلکہ یہ بھی کہ وہ یورپی طرز میں سوچیں۔ اسی طبقہ نے آخرکار اس تضاد کو دریافت کیا کہ ایک طرف یورپی مفکرین آزادی' اخوت اور مساوات کی بات کرتے تھے اور ان کے نظریات پر یورپی معاشرے میں عمل بھی ہو رہا تھا مگر نو آبادیات میں یہی لوگ جبر' نسل پرستی اور استحصال کے

ذریعہ حکومت کر رہے تھے۔ انہوں نے مغربی سیاسی تحریروں کے ذریعہ جمہوریت، قومیت اور سوشل ازم کے بارے میں سیکھا۔

قومیت کے جذبہ نے تعلیم یافتہ اور عوام کے درمیان ایک تعلق پیدا کیا اور جب انہوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف آزادی کی تحریک چلائی تو اس میں مختلف نسلی و مذہبی گروہ مل کر ایک ہو گئے۔ آزادی کی یہ تحریکیں کئی ملکوں میں بڑی خون ریز ثابت ہو گئیں اور یورپی حکمرانوں نے انہیں بیدردی سے کچلنے کی کوشش کی۔ اس لئے بیشتر تمام ملکوں میں جہاں یہ تحریکیں پر تشدد اور طویل رہیں، اور عوام نے ان میں شامل ہو کر جانی و مالی قربانیاں دیں جیسے انڈو چائنا اور الجیریا، ان ملکوں میں آزادی کے بعد ترقی کے امکانات زیادہ روشن ثابت ہوئے۔ لیکن ان ملکوں میں جہاں سیاسی ضرورت کے تحت یورپی طاقتوں کو آزادی دینی پڑی وہاں وہ اپنے تربیت یافتہ لوگوں کو چھوڑ آئے جو کہ معتدل قوم پرست تھے، اور آزادی کے بعد یہ طبقہ ان کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔

اس سلسلہ میں فرانز فینن نے بڑی پتہ کی بات کہی ہے کہ بدعنوانیوں اور مراعات کے باعث یہ طبقہ اقتدار کے فوراً بعد ہی سیاسی طور پر مفلس اور عریاں کا شکار ہو گا اور جب اس کے سامنے کوئی تاریخی مشن باقی نہیں رہا تو انہوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھیں۔ اس لئے وہ ایک ایسا طبقہ بن گیا جو نیو کلونیل ازم کی سرپرستی میں سیاسی، مالی اور فوجی لحاظ سے مستحکم ہو گیا اور عوام سے اپنا رشتہ کاٹ کر ان کا گماشتہ بن گیا۔

نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں جب کوئی سیاسی عہدے پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ لاتعداد حریف جماعتوں اور امیدواروں میں گھر جاتا ہے اور اسے ہر وقت اپنے قتل ہونے اور اقتدار سے محروم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی طاقت اور عہدے کو پوری طرح سے ذاتی مفادات پورے کرنے میں صرف کرے۔ چونکہ اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی مراعات یافتہ حیثیت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی لہٰذا وہ تھوڑے عرصہ میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے دولت کے حصول، ذاتی مفادات کے لئے وہ جمہوری اداروں کو بھی ادارے بنا لیتا ہے۔ اس عمل سے تیسری دنیا کے اکثر ملک "مرتد اور مفلس" حکومتوں میں تبدیل ہو گئے اور اپنے تحفظ کی خاطر غیر ملکیوں اور ان کی کمپنیوں کے لئے کام کرنے لگے۔ اس سے نیو کلونیل ازم کا ملک کی داخلی سیاست میں بھی اثر و رسوخ بڑھ گیا۔

دوسری جنگ عظیم تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی صنعتی ترقی کو اس قدر بڑھا لیا تھا کہ وہ دوسری یورپی طاقتوں کے مقابلہ پر آ گیا تھا اور اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی صنعتی

پیداوار کے لئے غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت تھی۔ اگرچہ 1898ء میں منرو نظریہ کے تحت امریکہ کا تسلط لاطینی امریکہ پر قائم ہو چکا تھا لیکن وہ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور ہالینڈ کی ایشیائی و افریقی نوآبادیات کو حسد و رشک سے دیکھ رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اسے بھی ان میں سے حصہ ملنا چاہئے۔ اس وقت امریکہ کی پالیسی "کھلے دروازے" (OPEN DOOR) کی تھی۔ وہ بین الاقوامی معاشیات میں آزادانہ تجارت چاہتا تھا۔ وہ بڑی طاقتوں کے "دائرہ اثر" کے بھی خلاف تھا اور مظلوم نوآبادیات کے عوام کے لئے حق خود اختیاری اور آزادی کا قائل تھا۔

لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ کیونکہ جنگ کے بعد ایک طرف فاتحین تھے تو دوسری طرف شکست خوردہ۔ اس میں وہ فاتحین بھی تھے جنہوں نے فتح کے علاوہ سب کچھ کھو دیا تھا اور وہ شکست خوردہ بھی تھے جنہوں نے فتح کے علاوہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ان میں امریکہ واحد ملک تھا جو سب سے زیادہ فائدہ میں رہا۔ اس نے ان امریکیوں کی قربانیوں کے بدلہ میں جو کہ اتحادیوں کی حمایت میں مارے گئے تھے، قیمت طلب کی اور قیمت یہ تھی کہ امریکہ کے زیر اثر ایک بین الاقوامی معاشی نظام تشکیل دیا جائے۔ یہ بات جنگ کے ابتدائی دنوں ہی میں "امریکن کونسل آف فارن ریلیشن" نے ایک میمورنڈم میں کہی تھی، جس میں امریکہ کی اقتصادی اور فوجی برتری کو غیر جرمن یورپ میں، برطانوی امپائر اور مشرق بعید میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ غیر جرمن علاقے "گرانڈ ایریا" (GRAND AREA) سے موسوم کئے گئے۔ نوآبادیات کو آزاد کرانا، ان کی منڈیوں پر قبضہ کرنا اور وہاں سے خام مال حاصل کرنا اس منصوبے کے اہم عناصر تھے۔

اس لئے دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی گرانڈ ایریا میں امریکی اثر و رسوخ قائم ہو گیا۔ اتحادی طاقتوں نے بہت جلد اس بات پر اتفاق کر لیا کہ امریکہ کی سربراہی میں بین الاقوامی معاشی تنظیم کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں ورلڈ بنک، آئی۔ ایم۔ ایف (IMF) اور گیٹ (GATT) کے اداروں کی تشکیل ہوئی۔ چند ہی سالوں کے اندر اندر آزاد دنیا کی معیشت کے گرد سیاسی و فوجی حصار باندھ دیا گیا (NATO) اور ٹرومین (1947ء) کے نظریہ کے تحت سوشلسٹ ملکوں کے خلاف سرد جنگ شروع کر دی گئی تاکہ ان کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ امریکہ نے اعلان کر دیا کہ "وہ عالمی پولیس مین کا کردار ادا کر کے آزاد لوگوں کی دنیا کے ہر حصے میں مداخلت کرے گا۔" اس غیر رسمی امپیریلزم کی امریکی پالیسی نے جو 1970ء تک رہی، اس کی چھپی ہوئی مداخلت نے اس کے عزائم کو بھی پردہ میں چھپا دیا، اور لوگوں کو اس کے صحیح عزائم کا پتہ نہ چلا۔

مثلاً بریٹن وڈز (BRETTON WOODS) کے مالیاتی سسٹم میں امریکی ڈالر اور سونے میں ایک رشتہ قائم کیا گیا۔ جب ڈالر کی حیثیت سونے کے برابر قرار پا گئی تو وہ دنیا کی ایک ایسی کرنسی ہو گئی کہ اسے کہیں بھی تبدیل کرایا جا سکتا تھا اور دوسری کرنسیوں کے مقابلہ میں اس کی قیمت بھی زیادہ تھی۔ اس وجہ سے امریکہ کی تجارتی کمپنیوں کو ڈالر کی قیمت میں ہر چیز سستی ملنے لگی اور ان کی یہ حیثیت ہو گئی کہ وہ دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ کاری کر سکیں۔ اس لئے 1945ء سے 1965ء تک امریکہ نے سمندر پار ملکوں میں سرمایہ کاری کی۔ 1988ء کے اعداد و شمار کی روشنی میں امریکی سرمایہ اور اس کے حصص دنیا میں سب سے زیادہ تھے۔

دوسری مثال گیٹ (GATT) کی ہے۔ یہ ادارہ امریکہ کے اصرار پر قائم کیا گیا تھا تاکہ تجارت کو آزاد کرایا جا سکے۔ آزاد تجارت کے بارے میں بسمارک نے کہا تھا کہ:

"آزاد تجارت مضبوط طاقت کے لئے ایک فطری پالیسی ہے۔"

جب جنگ کے بعد یورپی طاقتیں تباہ ہو گئیں اور انہیں اپنی صنعتوں کو دوبارہ لگانا پڑا تو اس وقت امریکہ ہی سب سے زیادہ صنعتی چیزیں پیدا کرنے والا ملک تھا۔ اس طرح یورپی ملکوں نے اپنی صنعتوں کو دوبارہ سے چلانے کے لئے امریکی فیکٹریوں سے مشینیں اور چیزیں خریدیں۔ امریکہ نے انہیں 13 بلین ڈالر کی مدد مارشل پلان کے تحت دی اور شرط یہ مقرر کی کہ وہ گیٹ کو تسلیم کریں۔ امریکی سرمایہ کاری کی اجازت دیں اور امریکی اشیاء درآمد کریں۔ اور یہ کہ کسی بھی کمیونسٹ کو اپنی حکومت میں شامل نہ کریں۔

اس طرح سے ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں امریکی امپیریلزم ذرائع ابلاغ، امداد اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ مسلط کیا گیا اور ان اداروں کو تیسری دنیا کے غیر منظم ملکوں کو قرضہ دینے اور ان ملکوں میں سرمایہ کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک وہ ادارے ہیں جن پر امریکی تسلط ہے، جن شرائط کے ساتھ یہ قرضے دیتے ہیں، ان کے تحت حقیقت میں یہ ان ملکوں کی حکومت چلاتے ہیں مثلاً یہ انہیں مجبور کرتے ہیں کہ کرنسی کی قیمت کم کریں، پبلک سیکٹر میں اخراجات گھٹائیں اور ایسی صنعتیں لگائیں جن سے انہیں فائدہ ہو۔ یہ ان حکومتوں پر اتنا دباؤ ڈالتے ہیں کہ انہیں پہلے قرضوں کی ادائیگی کی فکر ہوتی ہے اور اپنے عوام کو خوراک مہیا کرنے کا بعد میں سوچتے ہیں۔

جہاں امریکہ ان ان ڈائرکٹ طریقوں میں ناکام ہو جاتا ہے وہاں وہ براہ راست مداخلت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ 1945ء میں امریکہ نے یونان، کوریا، ویت نام، لبنان، ڈومینکن ریپبلک، گرینیڈا اور ایل سلواڈور میں مداخلت کی۔ اس کے علاوہ جب ضرورت پڑی تو

اس نے یونان، ترکی، ایران، گوئٹے مالا، جنوبی ویت نام، کمبوڈیا، جنوبی کوریا، یونان، کیوبا، چلی، گھانا، زائرے اور چلی کی حکومتوں کو بدلا۔

تاریخ ایک تسلسل اور تبدیلی کا نام ہے۔ اور ترقی پسند مورخوں کا فرض ہے کہ وہ اس عمل کو واضح کریں کیونکہ تاریخ کا صحیح تجزیہ ہی انسانیت اور دنیا کے عوام کی قسمت بدلنے کے لئے ضروری ہے۔

نوآبادیاتی نظام اور امپیریلزم میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام نے انتہائی اذیتیں برداشت کیں۔ اگر ان سے چھٹکارا پانے کے مواقع ملے بھی تو انہوں نے شعور کی کمی کی وجہ سے ضائع کر دیئے۔ آج پھر تیسری دنیا کے عوام اس بحران کے شکار ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عوام میں وہ شعور پیدا کیا جائے کہ وہ اس مرتبہ آزادی حاصل کرنے کے موقعوں کو نہ کھوئیں۔

1960ء کی دہائی میں جو غیر رسمی امریکی امپیریلزم پروان چڑھا تھا وہ اس وقت اپنے ہی بوجھ کے دباؤ سے کمزور ہو رہا ہے اور اس کی بلند و بالا عمارت میں شگاف پڑ چکے ہیں۔ اس کے جیو پولیٹیکل تعلقات اور ناٹو کے ملکوں کے مختلف مفادات کی وجہ سے یہ آپس میں برسرپیکار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اس لئے تیسری دنیا کے ملکوں کو امپیریلزم کی اس معاشی اور سیاسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی ترقی کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔

انقلاب کیا ہے؟

زبان میں ہر لفظ اور اصطلاح کی ایک تاریخ ہوتی ہے، بعض الفاظ اور اصطلاحات ایک خاص ماحول اور عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور پھر وقت بدلنے کے ساتھ ان کا استعمال ختم ہو جاتا ہے اور وہ متروک قرار دے دیے جاتے ہیں۔ مگر کچھ الفاظ اور اصطلاحات ایسی ہیں جو وقت کی تبدیلی اور معاشی و سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے معنی اور مفہوم کو بدلتی رہتی ہیں اور اس طرح تاریخی عمل کے پہلو بہ پہلو نئی جہتوں اور معنوں کے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔ انہیں الفاظ میں سے ایک لفظ ریولوشن ہے، جس کا ترجمہ اردو میں انقلاب کیا جاتا ہے۔

اس لفظ کی تاریخ معاشرے کی بدلتی ہوئی تاریخ سے متعلق ہے کیونکہ اس کا مفہوم اور معنی ہر عہد اور زمانہ میں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ آج یہ لفظ اپنی ابتدائی معنویت کھو کر وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اگر دیکھا جائے تو اس ایک لفظ میں انسانی سماج کی بدلتی ہوئی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔

ریولوشن کے لفظی معنی ہوتے ہیں 'واپس پلٹنا' 'دہرانا' بار بار ہونا۔ اس طرح اس کے دو مفہوم نکلے۔ اول: حرکت کے ساتھ تبدیل ہونا، دوم: حرکت کے ساتھ کسی چیز کا دوبارہ سے اپنے مرکز پر واپس آجانا، ایک چکر میں گردش کرنا، یا مدوجزر کی صورت میں اترنا اور چڑھنا۔

قدیم یونان اور روم میں ریولوشن انہیں معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس مفہوم کے ذریعہ سیاسی نظام میں تبدیلی تو آتی تھی مگر یہ تبدیلی ایک چکر میں ہوتی تھی۔ اسی لئے افلاطون سے لے کر مشہور مورخ پولی بیس تک نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی نظام ایک چکر میں گردش کرتے ہیں، یعنی بادشاہت، آمریت، امراء کی حکومت، جمہوریت، اور جمہوریت کے نتیجہ میں چونکہ انتشار، بدامنی، اور افراتفری پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اس کا منطقی حل یہی ہے کہ دوبارہ سے بادشاہت آجاتی ہے۔ سیاسی نظاموں کی یہ تبدیلی انقلاب کہلاتی تھی۔ یہ ایک چکر تھا جو جاری رہتا تھا اور اسے بار بار دہرایا جاتا تھا، اور اس سے کسی صورت میں نجات ممکن نہیں تھی۔ چونکہ اس وقت تک بادشاہت کے نظام کو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا

اور اس میں تمام ذمہ داریاں اور اختیارات ایک شخص کو سونپ دیے جاتے تھے۔ اسی کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ ملک میں امن و امان کو قائم کرے، اس کا بیرونی حملوں سے دفاع کرے، اور رعیت کی نگہداشت اس طرح کرے کہ جیسے ایک چرواہا اپنے گلہ کی کرتا ہے۔ اس کے برعکس جمہوری نظام کو برائیوں کی جڑ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس میں ذمہ داری کسی ایک فرد واحد پر نہیں ہوتی تھی۔ اور عوام کے ایک منتخب حصہ کو یہ حق مل جاتا تھا کہ وہ حکومت کے کاموں میں شریک ہوں۔ اس لئے یہ نظام مراعات یافتہ طبقوں کے لئے ناپسندیدہ تھا، اور جب بھی یہ نظام قائم ہوتا تو وہ اس کے خلاف متحد ہو جاتے تھے، اور جب اس کے نتیجہ میں ملک میں بدامنی اور شورش ہوتی تو وہ اس کی ساری ذمہ داری جمہوری طرز حکومت پر ڈال دیتے، اور اپنی خواہشات کے مطابق دوبارہ سے بادشاہت کو قائم کرتے تاکہ ان کی مراعات پھر سے قائم ہو جائیں۔ اس لئے مراعات یافتہ طبقہ انقلاب کو پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ بار بار سیاسی نظام بدلتے تھے، معاشرہ کے ڈھانچہ میں تبدیلی آتی تھی۔ اس لئے ان کی خواہش تو یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح سے انقلاب کو روکا جائے اور تاریخ کے عمل کو ایک جگہ ٹھہرا کر رکھ دیا جائے۔

قرون وسطیٰ میں سیاسی حالات کی تبدیلی نے انقلاب کے مفہوم میں ایک تبدیلی کی، اگرچہ اس عہد تک صرف بادشاہت کو ایک نظام سمجھا جاتا تھا کہ جس میں تحفظ، عدل، انصاف اور سکون تھا، اس لئے بادشاہت کے خلاف کسی بغاوت کو جرم سمجھا جاتا تھا، لیکن جب بادشاہت کا ادارہ اس عہد میں مضبوط ہو گیا، اور دوسرے سیاسی نظام اس کی جگہ نہیں لے سکے تو خاندانی بادشاہت نے ظالم، عیاش اور نااہل حکمرانوں کو پیدا کیا، اور انہوں نے جب اپنے اختیارات کے غلط استعمال سے لوگوں پر ظلم و ستم شروع کئے تو اس وقت یہ بحث شروع ہوئی کہ اگر بادشاہ خراب ہے تو کیا اس کو ہٹانے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جائے؟ اور کیا ایسے بادشاہ کے خلاف بغاوت جائز ہے؟ اس بحث میں خرابی کی ذمہ داری شخصیت پر ڈالی جاتی تھی ادارے پر نہیں کیونکہ ادارے کی اہمیت کو اس وقت تک زیادہ محسوس نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اس بحث کے نتیجہ میں خراب بادشاہ کو تو ہٹایا جا سکتا تھا مگر بادشاہت کے ادارے کو تبدیل کر کے اس جگہ کسی دوسرے سیاسی نظام کو قائم کرنے کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ 1176ء میں جان آف سالس بری نے اس بات کا واضح الفاظ میں اظہار کیا کہ کسی ظالم بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا، اور اسے قتل کرنا مذہب کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ یہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے برعکس مشہور عیسائی دانشور ٹامس اکیونا نے 1274ء میں کہا کہ "امراء اور ظالم بادشاہ کے خلاف بغاوت سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ اس سے رد عمل کا ایک سلسلہ

شروع ہو جائے گا جس کے نتیجے میں امن و امان برباد ہو جائے گا۔ اس لئے ہر آمر اور ظالم بادشاہ کو برداشت کرنا چاہئے کیونکہ بد امنی کی صورت میں بغاوت ہو گی جو معاشرے کے سکون کو برباد کر دے گی۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار عہد عباسیہ کے آخری عہد میں مسلمان فقیہ الماوردی نے اپنی کتاب احکام السلطانیہ میں کیا کہ اگر کوئی غاصب طاقت کے زور پر حکومت پر قابض ہو جائے تو اسے اس لئے جائز حکمران تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس کے پاس قوت و طاقت ہے۔

مشہور عیسائی مصلح کالون (1563ء) نے بھی بغاوت کی مخالفت کی اور کہا کہ تکلیف اٹھانا بغاوت کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ ان نظریات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بادشاہت کے ادارے کا استحکام مراعات یافتہ طبقوں کے مفادات میں تھا، کیونکہ ایک ظالم اور عیاش حکمران بھی امراء اور مذہبی علماء کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ اس لئے قرون وسطیٰ میں انقلاب کی اصطلاح کا مفہوم بغاوت، شورش، سرکشی اور خانہ جنگی تھا، اور اس مفہوم کو وہ صرف حکمران کے تبدیل ہونے یا حکمران خاندان کے بدلنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس میں انقلاب کی کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ اسے محض ایک بیانیہ اصطلاح کے استعمال کیا جاتا تھا۔

سترہویں صدی تک انقلاب کو انہیں معنوں میں لیا جاتا تھا کہ ایک ایسا سلسلہ جو مرحلہ وار درجہ بدرجہ گزر کر پھر اپنے مرکز پر واپس آجائے۔ مگر اس صدی کے آخر میں اس کے معنوں میں تبدیلی آئی اور اب سے اس مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا کہ وہ تبدیلی جو ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دے اور مکمل طور پر کسی چیز کو بدل دے۔ اس میں ریاست کے معاملات میں گہری تبدیلی کا ہونا، حکمران خاندانوں کا بدلنا، اور دستور کا بدلنا شامل تھا۔ اسی پس منظر میں انگریزی کے شاعر ملٹن نے 1749ء میں چارلس اول کی سزائے موت کو صحیح کہا، اور کہا کہ انقلاب، ایک اچھی چیز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ لوگ حکومت تبدیل کر کے ایسی حکومت قائم کرتے ہیں جو ان کے مفادات کے لئے بہتر ہوتی ہے۔

اس عہد میں مفکرین نے اس بات پر بھی بحث کی کہ چونکہ حکمران اور عوام کے درمیان ایک معاہدہ ہے، اس لئے اگر بادشاہ معاہدہ سے آگے بڑھ جاتا ہے اور ناانصافی کرتا ہے، اپنے فرائض سے غفلت برتتا ہے تو اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور ایسی صورت میں بادشاہت کے ادارے کو ختم کرنا درست ہے۔ انہیں خیالات کو لبرل ازم میں حقوق انسان کے نام سے پیش کیا گیا۔ جس کے تحت اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام کو قرار دیا گیا۔

انگریزی مفکر جان لاک نے حقوق انسانی کے بارے میں کہا کہ یہ وہ نہیں ہیں کہ جنہیں

دستور اور قانون کے ذریعہ دیا جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں انہیں واپس بھی لیا جا سکتا ہے بلکہ یہ حقوق اس لئے ہیں کہ وہ انسان ہے، ان حقوق کی جڑیں فطرت میں ہیں۔ اسی لئے یہ معاشرہ کی مخالفت کے باوجود باقی رہتے ہیں کیونکہ یہ حقوق معاشرے کی تشکیل سے پہلے تھے اس لئے انہیں چھینا جائے، اور ختم کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو اس کی اطاعت کی ضرورت نہیں، کیونکہ حکومت کا فرض ان حقوق کی حفاظت کرنا ہے انہیں ختم کرنا نہیں۔

حقوق انسان کے اس تصور کے پس منظر میں متوسط طبقے کی خواہشات اور امنگیں تھیں جو حکومت کی طاقت کو محدود کر کے اپنی سرگرمیوں کو وسعت دینا چاہتے تھے، جن میں تجارت اور صنعت کا فروغ شامل تھا۔ آگے چل کر ان خیالات کا اثر امریکی اور فرانسیسی انقلابات پر ہوا، اور ان کے دستوروں میں حقوق انسان کو شامل کیا گیا۔

فرانسیسی انقلاب کے بعد اس کے معنوں اور مفہوم میں تبدیلی آئی۔ اب اس کا مطلب گردش والا نہیں رہا، بلکہ تاریخی عمل کی وہ کیفیت جو بنیادی تبدیلی لائے اسے انقلاب کہا گیا۔ اس کے نتیجہ میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ قانونی، تجارتی، سماجی اور اقتصادی طور پر جو بنیادی تبدیلی آئی اسے بھی انقلاب کہا گیا۔

امریکہ میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے خلاف جو جدوجہد ہوئی اسے ابتداء میں امریکی انقلاب نہیں کہتے تھے، بلکہ جنگ آزادی کہتے تھے، مگر 1787ء میں ٹامس پین نے اس کے لئے انقلاب کی اصطلاح کو استعمال کیا، اور بعد میں یہی مستعمل ہو گئی۔ فرانسیسی انقلاب نے اس لفظ کو مزید وسعت دی، اور بیسٹیل کی فتح فرانسیسی انقلاب کی علامت بن گئی۔ اس انقلاب نے ترقی اور جمہوریت کے خیالات کو فروغ دیا اور انقلاب کا یہ مفہوم ہوا کہ حکومت کے خلاف عوامی جدوجہد، شہریوں کا فوج سے مقابلہ کرنا، اور شہروں کا سیاسی سرگرمیوں اور انقلابی جدوجہد کا مرکز بننا اور اس کے نتیجہ میں بنیادی سیاسی، معاشی و سماجی تبدیلی کا آنا۔

فرانسیسی مفکر کونڈورسے نے اس بات پر زور دیا کہ انقلاب کا لفظ صرف ان تبدیلیوں کے لئے استعمال کیا جائے کہ جن کا مقصد آزادی ہو۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد وہاں حالات نے جو رخ اختیار کیا، تو اس کے نتیجہ میں تشدد، قتل و غارت گری، اور قدیم نظام کے خلاف گہرے نفرت کے جذبات ابھرے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ انقلاب ہر ادارے، روایت اور قدر کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے، اور اس کے آنے سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ طبقات جو قدیم نظام میں تمام مراعات سے فائدہ اٹھاتے تھے انہوں نے اس کی سخت مخالفت

کی اور انقلاب کو جان و مال اور جائداد کے تحفظ کے لئے خطرہ سمجھا' اور انقلاب کا یہ تاثر دیا کہ اس سے تشدد' خون ریزی پیدا ہوتی ہے' اور اس عمل سے انتشار و بے چینی جنم لیتی ہے۔ اس طرح سے ایک دور پھر الٹا گردش والا نظریہ دہرایا گیا کہ تاریخ بادشاہت' انارکی' تشدد اور فوجی آمریت کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ آسٹریا کے چانسلر میٹرنک اور جرمنی کے چانسلر بسمارک نے انقلاب کی اسی وجہ سے مخالفت کی کہ اس کے نتیجہ میں آمریت و مطلق العنانیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جب انقلاب ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر برباد کر دیتا ہے' اور عوام کو بغیر تحفظ کے لاقانونیت کے ماحول میں لا کھڑا کرتا ہے تو اس وقت وہ ہر اس طاقت کی حمایت کرتے ہیں جو انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس نظریہ کے تحت فرانسیسی انقلاب نے نپولین کو پیدا کیا اور روسی انقلاب نے اسٹالن کو جنم دیا' دونوں نے انقلاب کے اثرات کو ختم کر کے آمریت و مطلق العنانیت کو قائم کیا۔

تاریخی عمل کے نتیجہ میں اس وقت انقلاب کا جو مفہوم ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ اچانک اور تشدد کے ذریعہ سیاسی اداروں' اور سماجی و معاشی اقدار و روایات کی تبدیلی کہ جس سے انسانی حقوق کی حفاظت ہو اور یہ انقلاب قدیم عہد کو ختم کر کے ایک نئے عہد کی ابتداء کرے۔ انقلاب کے اس مفہوم کے تحت فرانسیسی' روسی اور چینی وہ بڑے انقلابات ہیں کہ جن کے ذریعہ بنیادی تبدیلی آئی' حکمران طبقے بدل گئے' اور پورا معاشرتی و معاشی ڈھانچہ نئی بنیادوں پر استوار ہوا۔ اس لئے انقلاب کا مطلب ہوا کہ وہ تبدیلی جو حکمران طبقوں کو بدلے' اور قدیم نظام کو مسمار کر کے نئے نظام کی ابتداء کرے۔ اس عمل میں تشدد کو لازمی طور پر اس لئے اختیار کرنا پڑتا ہے کہ بغیر اس کے قدیم نظام کے حامی اپنی مراعات اور حیثیت کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے صحیح انقلاب وہ ہے کہ جو انسانوں کے چھینے ہوئے حقوق انہیں واپس دلائے اور معاشرہ میں مساوات اور انصاف کو قائم کرے۔ اٹھارویں صدی سے پہلے انقلاب کی بات ملک سے باہر مقبولیت نہیں ہوتی تھی' مگر فرانسیسی انقلاب نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں مقبول ہوا' اور انہیں اپنے نظریات سے متاثر کیا۔ روسی انقلاب نے انقلاب کے تصور میں یہ تبدیلی کی کہ یہ اچانک سیاسی حکومتوں کے بدلنے کا نام نہیں' بلکہ سیاسی تبدیلی ایک طویل انقلابی عمل کی ابتداء ہوتی ہے' کہ جس کے دوران معاشی و سماجی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں اور معاشرہ کو مکمل طور پر بدلا جاتا ہے۔

انقلاب کے ان مثبت نتائج نے اس لفظ کو مقبول عام بنا دیا' اور اس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ انقلاب کے ذریعہ جو بھی تبدیلی آتی ہے وہ عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کے تحفظ

کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے عوام میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ صرف انقلاب ہی کے ذریعہ معاشرہ میں بنیادی تبدیلی کو لایا جا سکتا ہے۔ اسی میں ان کی نجات ہے اور اسی کے ذریعہ وہ ظلم و ستم سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔

اس وجہ سے انقلاب ایک سحر انگیز لفظ ہو گیا ہے' جو عوام کی امنگوں اور خواہشات کا ترجمان ہے۔ اس لئے عوام کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے اس لفظ کو آمروں اور مطلق العنان شخصیتوں نے بھی استعمال کیا کہ جن کی حکومتیں فاشزم کے اصولوں پر قائم تھیں' مگر انہوں نے اپنے اقتدار میں آنے کو انقلاب سے موسوم کیا۔ بورژوا طبقے بھی جو قدیم نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے' انہوں نے انقلاب کی اصطلاح استعمال کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان کی حکومتیں بنیادی تبدیلی کی حامی ہیں' اس لئے ان حکومتوں میں جو نام نہاد اصلاحات کی گئیں انہیں انقلاب کا نام دیا گیا جیسے شاہ ایران نے اپنی زرعی اصلاحات کو سفید انقلاب کہا' حالانکہ یہ اصلاحات نہ تو حکومتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی لائیں اور نہ زراعت میں۔

نوآبادیات کے خاتمہ کے بعد جب ایشیا' افریقہ' اور لاطینی امریکہ کے ممالک آزاد ہوئے تو ان ملکوں میں آزادی کے بعد عوام میں یہ امیدیں تھیں کہ وہ بہت جلد غربت و افلاس' اور جہالت سے نجات پا لیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا اور جان و مال کی قربانیاں دیں' مگر جب ان ملکوں میں بورژوا طبقے برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے نوآبادیاتی نظام کو اسی طرح سے برقرار رکھا اور انہیں اداروں کے ذریعہ اپنے عوام کا استحصال جاری رکھا۔ جب عوام میں ایسی حکومتوں کے خلاف نفرت بڑھی تو فوج نے اس سے فائدہ اٹھایا' اور ان کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہو گئی۔ فوج کا اچانک حکومت پر قبضہ کرنا "کو" کہلاتا ہے' مگر انہوں نے اسے انقلاب کا نام دیا' اور تھوڑے وقت کے لئے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اصلاحات بھی شروع کیں۔ مگر کہیں بھی اس فوجی حکومت نے نہ تو حکمراں طبقوں کو بدلا اور نہ ہی عوام کو اقتدار میں شریک کیا۔ اس لئے یہ حکومتیں محض انقلاب کا نام تو لیتی رہیں' مگر بنیادی طور ان کا طرز حکومت آمرانہ ہی رہا۔ اسی طرح سے انقلاب کے لفظ کو جب ہر آمر اور ڈکٹیٹر نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا تو اس سے لفظ کی سحر انگیزی میں فرق تو ضرور آیا' مگر اب عوام اپنے سیاسی شعور کے بڑھنے کے ساتھ اس فرق کو سمجھ گئے ہیں کہ کون سا انقلاب تبدیلی لاتا ہے اور کون سا انقلاب محض نعرے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ فرق اگر ذہن میں ہو تو انقلاب اب بھی اپنے میں جاذبیت اور دلکشی لئے ہوئے ہے' دلوں میں گرمی اور مایوسی میں امید کی روشنی لے کر آتا ہے۔

انقلاب کا بدلتا مفہوم

معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انقلاب کے لفظ کا استعمال دوسرے شعبوں میں بھی ہوا۔ مثلاً اس لفظ کو سولہویں صدی میں ستاروں کی حرکت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا' اور مشہور سائنس داں کوپرنیکس کی کتاب میں یہ لفظ شامل ہے۔ اس وقت یہ عقیدہ تھا کہ ستاروں کی حرکت سے زمین کے حالات متاثر ہوتے ہیں اور زمین کا انقلاب آسمان پر ہونے والے انقلاب سے متاثر ہوتا ہے۔ کوپرنیکس نے جو نظریہ پیش کیا اس سے آسمان پر انقلاب آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر اس سے زمین پر ذہنوں میں ضرور ایک انقلاب آگیا۔ کیونکہ اس نظریے کے تحت زمین کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور وہ بھی اس وسیع کائنات میں دوسرے سیاروں کی طرح ایک معمولی اور حقیر سیارہ بن گئی۔ اس نے انسان کی برتری کو بھی ختم کر دیا اور وہ ایک غیر اہم مخلوق بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد سائنس دانوں نے جو فکر انگیز نظریات پیش کیے اس نے سائنسی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اس انقلاب کی وجہ سے معاشرے میں جو ذہنی تبدیلی آئی اس نے پورے معاشرے کے معاشرتی' اقتصادی و سیاسی ڈھانچوں کو بدلنے میں مدد دی۔

کوپرنیکس کے بعد دو اہم سائنسی نظریات نے سائنسی انقلاب کو اور موثر بنایا۔ اس میں ایک ڈارون کا نظریہ ارتقاء تھا۔ جس نے مذہب کے تخلیق کے عقیدے کی نفی کر کے اسے رد کر دیا۔ دوسرا آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت تھا کہ جس کی وجہ سے اب ہر چیز اضافی ہو گئی ہے اور کوئی قدر' ادارہ' روایت' اور عقیدہ اب آفاقی اور ابدی نہیں رہا ہے۔ اس نے عقائد کی دنیا میں ایک زبردست انتشار پیدا کر دیا۔

سائنسی انقلاب کے نتیجہ میں عقلیت کا عروج ہوا' اور عقیدہ کمزور ہوا۔ اس کے زیر اثر دوسرے علوم بھی تجربات اور دلائل کی روشنی میں سائنسی اصولوں پر تشکیل ہونا شروع ہوئے تاکہ ہر چیز کی وجہ دریافت کی جا سکے اور معاشرتی اور سماجی عمل کے قوانین دریافت کیے جا سکیں۔

سائنسی انقلاب کا اثر یہ ہوا کہ انسانی معاشرہ جو اب تک توہمات اور اندھے عقائد میں جکڑا ہوا تھا' وہ اس سے نجات پا رہا ہے۔ ہر نئی سائنسی ایجاد اور نظریہ انسان کو برابر مافوق

الفطرت قوتوں سے آزاد کرا رہا ہے۔ انسان اب نہ صرف اس دنیا کو اور کائنات کو سمجھ رہا ہے بلکہ خود وہ اپنے آپ سے بھی آگاہ ہو رہا ہے۔ اس کے سماجی اور سیاسی معاملات پر بھی اثرات ہو رہے ہیں، مثلاً ایک زمانہ میں نسل کا نظریہ سفید اقوام میں بڑا مقبول تھا، اور وہ خود کو دوسری رنگ دار نسلوں سے برتر سمجھتے تھے۔ اب سائنس نے ان تمام باتوں کی تردید کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے دوسری رنگ دار نسلوں میں اعتماد اور یقین پیدا ہوا ہے اور وہ ترقی کی دوڑ میں تیزی سے شریک ہو رہے ہیں۔

سائنسی ایجادوں نے انسان کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرے میں ذات پات، طبقہ و خاندان کی اجارہ داری کم ہو گئی ہے اور جمہوری اقدار کا فروغ ہوا ہے۔ ذرائع آمد و رفت نے دنیا کی اقوام کو ایک دوسرے سے قریب کر کے پرانے تعصبات اور نفرتوں کو دور کیا ہے۔

سیاسی اور سائنسی انقلابوں کو کامیاب بنانے میں چھاپہ کی مشین کی ایجاد نے اور چھاپہ خانوں کے قیام نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ خیالات کو پھیلایا جا سکے اور انہیں عوام کے ہر طبقہ تک پہنچایا جا سکے۔ اس وجہ سے چھاپہ خانہ کے قیام کو ایک انقلاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے تعلیم ایک محدود طبقہ میں تھی۔ کتابیں قلمی ہونے کی وجہ سے نہ صرف قیمتی تھیں بلکہ عام آدمی کی پہنچ سے دور بھی تھیں۔ مفکروں اور دانشوروں کے خیالات خاص حلقوں تک محدود رہتے تھے اور عوام تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی۔ چھاپہ خانہ نے ان مسائل کو حل کر کے کتابوں اور تعلیم کو عام کر دیا۔ امریکی، فرانسیسی، روسی، اور چینی انقلابوں میں مصنفوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف لوگوں میں تبدیلی کی خواہش کو بیدار کیا بلکہ قدیم نظام کے خلاف نفرت پیدا کی۔ چھپائی ہی کے نتیجہ میں جب اخباروں اور رسالوں کی ابتداء ہوئی تو اس نے ایک دوسرے انقلاب کی بنیاد رکھی۔ لوگ ہر روز کی خبروں اور تبدیل ہوتے ہوئے حالات سے باخبر رہنے لگے، اسی لئے پریس کو "فورتھ اسٹیٹ" کہا گیا جس کی طاقت و قوت سے حکومتیں بھی ڈرتی ہیں۔ اسی لئے غیر جمہوری حکومتیں پریس اور کتابوں پر سنسر شپ کی پابندیاں عائد کرتی ہیں تاکہ لوگ حقیقت سے باخبر نہ ہوں اور انہیں سیاسی آگہی کا احساس نہ ہو۔ لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود چھپے ہوئے الفاظ لوگوں میں حرکت پیدا کرتے رہتے ہیں، اور انہیں متحرک رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

سائنسی انقلاب کے نتیجہ میں زراعتی پیداوار میں سبز انقلاب آیا۔ اگرچہ اس لفظ کو سیاسی معنوں میں استعمال کیا گیا اور اسے سرخ انقلاب کے مقابلہ میں لایا گیا مگر یہ ضرور ہے کہ

سائنسی ایجادات نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کیا، اور اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو بھوکا نہیں رہنا چاہئے۔ مگر آج بھی قحط پڑتے ہیں، خشک سالی کے سبب غلہ کی کمی ہوتی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ زراعتی پیداوار کی تقسیم صحیح نہیں۔

اس ضمن میں صنعتی انقلاب کا تذکرہ بھی ضروری ہے، یہ ان فنی اور سائنسی ایجادات کی وجہ سے آیا کہ جنہیں انسان کی جگہ دی گئی۔ اب تک جو کام انسان کرتا تھا اب وہ کام مشینوں کی مدد سے کیا جانے لگا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی حرکت اور توانائی کی جگہ غیر جاندار اشیاء نے لے لی۔ دستکاری کے بجائے اب اشیاء جدید مشینوں کی مدد سے بنائی جانے لگیں۔ اس سے یہ انقلابی تبدیلی آئی کہ زراعتی معاشرہ جس میں معیشت کی بنیاد زراعتی پیداوار اور دستکاری پر تھی، اب وہ بدل کر صنعتی ہو گیا، اور پیداوار کا ذریعہ مشینیں ہو گئیں۔

صنعتی انقلاب نے معاشرہ کے معاشرتی اور سماجی ڈھانچہ کو بدل کر رکھ دیا۔ زمیندار کی جگہ سرمایہ دار نے لے لی۔ کسانوں کی جگہ مزدور آ گئے، چھوٹے قصبے اور گاؤں بڑے آبادی والے گنجان شہر بن گئے۔ زندگی کا وہ جمود جو دور جاگیرداری میں تھا وہ ٹوٹ گیا۔ یہ ضرور ہے کہ صنعتی انقلاب کے اثرات یورپ میں زیادہ ہوئے۔ یہ انگلستان سے شروع ہوا اور پھر یورپ کے دوسرے ملکوں میں پھیلا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے ملکوں میں یہ انقلاب اب تک نہیں آیا ہے۔ اس لئے وہاں اس کے اثرات بھی نہیں آئے ہیں۔

انقلاب کی ایک قسم ثقافتی انقلاب بھی ہے۔ ہر سیاسی حکومت اپنے استحکام کی خاطر آرٹ و ثقافت کو استعمال کرتی ہے۔ لیکن دانشور، ادیب و شاعر اور مصور اپنے فن کو اگر عوام کے لئے استعمال کریں، تو اس سے انقلابی عمل کو تیز تر کیا جا سکتا ہے۔ "بیسویں صدی میں دانشوروں و مصوروں نے آرٹ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا تاکہ عوام کے سیاسی شعور کو بلند کیا جائے" انہوں نے سماجی نظام پر تنقید کر کے اس کی خرابیوں کو اجاگر کیا، اور لوگوں کو ذہنی طور پر بیدار کر کے انہیں عملی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔

موجودہ زمانہ میں انقلاب کی اصطلاح اس قدر مقبول ہو گئی ہے کہ یہ اب ہر نئی سائنسی ایجاد، نظریہ، فکر اور خیال کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اور "انقلابی تبدیلی" کو ہر بات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر جدید اور چونکا دینے والی بات اس کی علامت ہے کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ اور اس تبدیلی کو وہ انقلاب کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔

انقلاب کے نظریات

مارکس نے انقلاب کے نظریہ کو سائنس کی بنیادوں پر استوار کیا' اور دنیا کی تاریخ کی تشریح اس طرح سے کی کہ اسے مختلف ادوار اور درجوں میں تقسیم کیا' اور پھر اس بات کو ثابت کیا کہ تاریخ میں اقوام عالم ایک عہد سے دوسرے عہد میں سماجی انقلاب کے ذریعہ گئیں۔ یہ سماجی انقلاب تاریخ کے لئے ناگزیر تھا کیونکہ اس نے بنیادی تبدیلیوں کے ذریعہ انسانی معاشرے کو آگے کی جانب بڑھایا۔

مارکس کے نظریات کے مطابق ہر عہد کی سیاسی و سماجی و معاشی تاریخ' ادب' رسم' روایات اور عقائد پیداواری طریقوں کے زیر اثر تشکیل ہوتے ہیں اور تاریخ کے ہر عہد میں طبقاتی جدوجہد جاری رہی ہے اور سماجی تاریخ اسی طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ انسانی معاشرہ میں انقلاب وہ درجہ ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی لاتا ہے۔ چونکہ وہ سماجی انقلاب کو پیداواری ذرائع سے منسلک کر دیتا ہے اس لئے وہ سیاسی انقلاب سے سے جدا کر دیتا ہے کیونکہ سیاسی انقلاب صرف سیاسی حکومت کی تبدیلی کا عمل ہوتا ہے۔ سیاسی انقلاب' سماجی انقلاب کا ہراول دستہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ حکمراں طبقوں کا خاتمہ ہوتا ہے تو مکمل انقلاب وہ ہے جو ذرائع پیداوار میں تبدیلی لائے اور معاشرہ کو بنیادی طور پر تبدیل کرے سیاسی اور سماجی انقلاب ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور علیحدہ بھی۔ بقول مارکس۔ "ہر انقلاب قدیم حکومت کو الٹ دیتا ہے اس نقطہ نظر سے یہ سیاسی انقلاب ہے۔"

سماجی انقلاب ہمیشہ ترقی کی جانب ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے فرسودہ اور بیکار روایات ختم ہو کر اس کی جگہ ترقی پذیر اور روشن خیال قوتیں جگہ لیتی ہیں۔ اس طرح سماجی انقلاب میں رجعت پسند اور ترقی پسند دونوں قوتیں متصادم ہوتی ہیں اور بغیر طبقاتی جدوجہد کے یہ انقلاب مکمل نہیں ہوتا ہے۔

انقلاب کی شرط یہ ہے کہ طاقت و اقتدار ایک طبقہ سے نکل کر دوسرے طبقے کے ہاتھ میں آئے۔ انقلاب اور کو میں یہی فرق ہے کیونکہ کو میں صرف شخصیتیں اور جماعتیں بدلتی ہیں' یہ سازش کے ذریعہ ہوتا ہے' اور اس کے ذریعہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

انقلاب تاریخ میں اس لئے اہم رہے ہیں کہ یہ معاشی استحصال کو ختم کر کے معاشرہ کو آزادی اور امداد باہمی پر منظم کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کی سرحدوں کو توڑتے ہیں' اور جب معاشرہ ایک عہد سے دوسرے عہد میں آتا ہے تو اس کی ترقی کی علامت ہوتا ہے' ہر دور میں معاشی پیداوار آگے کی جانب بڑھتی ہے' اور اس کے ساتھ آزادی کی حدود بھی وسیع ہوتی ہیں۔ ہر نیا دور اس لئے قدیم دور سے آگے ہوتا ہے کہ یہ کمیونزم کے مرحلے کو قریب لاتا ہے۔

لہٰذا مارکس کے مطابق سماجی انقلاب وہ ہے کہ جس کے ذریعہ نظام میں بنیادی تبدیلی لائی جائے اور یہ تبدیلی عوام کی اکثریت کی خواہش کے مطابق ہو' اور اس کو تبدیل کرنے میں ان کی شرکت ہو' اس لحاظ سے یہ سیاسی انقلاب سے مختلف ہوتا ہے جو کہ عوام کی شرکت کے بغیر اوپر سے دیا جاتا ہے۔

سماجی انقلاب اس وقت آتا ہے جب کہ اصلاحات کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا پہلا کام ریاست پر قبضہ کر کے اس کے تمام اداروں کو ختم کرنا ہوتا ہے تاکہ پرولتاری طبقہ کی آمریت کو قائم کیا جائے۔ سماجی انقلاب جمہوری اقدار کے حق میں ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ عوام کی اکثریت کو با عمل بنایا جاتا ہے۔

1850ء میں مارکس نے دائمی انقلاب کی اصطلاح کو استعمال کیا' جس کا مطلب تھا کہ ایک بار جب سماجی انقلاب ایک معاشرہ میں آ جائے گا تو اس کے زیر اثر دوسرے معاشروں میں انقلابی تبدیلیاں جاری رہیں گی یہاں تک کہ طبقاتی تضادات ختم ہو جائیں گے۔ ٹراٹسکی نے روس میں انقلاب کے بعد اس بات کا اعادہ کیا کہ یہ انقلاب یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی آئے گا' اور جب یہ عمل شروع ہو گا تو رکے گا نہیں اور دائمی شکل اختیار کرے گا یہاں تک کہ سوشلزم دنیا پر فتح حاصل کرے گا۔

مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف پرولتاری انقلاب کی راہیں متعین کیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق جس طرح اب تک تاریخ انقلابات کے ذریعہ بدلتی رہی ہے' اسی طرح نظام سرمایہ داری بھی اصلاحات کے ذریعہ نہیں بدلا جائے گا' بلکہ اس نظام کے تضادات انقلاب کو لازمی بنا دیں گے' اور یہ انقلاب اس نظام کے پرولتاری لے کر آئیں گے۔ سرمایہ داری نظام پرولتاری طبقہ کے استحصال پر قائم ہے' انہیں معاشی طور پر محروم رکھ کر اور ان کی محنت کے سرپلس پر سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ اس لئے پرولتاری طبقہ اپنی محنت کے پھل سے محروم' انقلاب کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔ اب یہ انقلابی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ ان میں سیاسی شعور پیدا کریں تاکہ وہ اپنے تاریخی کردار سے واقف ہو سکیں اور جدوجہد کے لئے تیار ہوں۔

مارکس کے مطابق۔ "تاریخ کی پچھلی تمام تحریکیں اقلیتوں کی تھیں جب کہ پرولتاری خود آگہی سے معمور اکثریت کی خود مختار تحریک ہو گی اور یہ تحریک اکثریت کے مفاد میں ہو گی۔ اس لئے وہ جو نیا معاشرہ تشکیل دیں گے اور جسے اکثریت کی حمایت ہو گی وہ ان طبقوں کو بھی پورے پورے حقوق دیں گے جو استحصالی نظام کا حصہ تھے۔ مارکس اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

"ورکنگ کلاس کی آزادی طبقاتی مراعات کے لئے نہیں ہو گی' بلکہ حقوق و فرائض کے لئے ہو گی' اور اس کے ذریعہ سے تمام طبقاتی مراعات کا خاتمہ ہو گا۔"

مارکس نے بلانکی' مازنی' اور باکونن کے اس خیال کو رد کیا کہ انقلابیوں کی ایک محدود جماعت سازش اور تشدد کے ذریعہ انقلاب لا سکتی ہے اور اس کے لئے صنعتی مزدوروں کی حمایت اور انہیں متحد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف سیاسی و معاشی انتشار اور بحران جو حکومتوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں' ان سے فائدہ اٹھا کر عوام کو اپنے ساتھ شریک کیا جائے۔

مارکس کے نظریہ کے مطابق اس طرح سے سوشلسٹ انقلاب نہیں آسکتا ہے۔ ایک بامقصد انقلاب کے لئے اکثریت میں شعور کا ہونا لازمی ہے۔ اقلیت اگر محض حالات کو استعمال کر کے انقلاب لے بھی آئے تو یہ پائیدار نہیں ہو گا' اس کے لئے پرولتاری طبقہ کا باشعور ہونا' منظم ہونا' اور اس کا انقلابی جدوجہد سے واقف ہونا ضروری ہے۔ وہ اس پر زور دیتا ہے کہ۔ "سماجی انقلاب لانے والے اور بے گانگی دور کرنے والے پرولتاری ہیں اور یہ انقلاب کے ذریعہ ایسا معاشرہ قائم کریں گے جو استحصال سے پاک ہو گا۔"

پرولتاری طبقہ کا اس لئے بھی منظم ہونا ضروری ہے کہ جب وہ سرمایہ داری کے نظام کو ختم کر کے مراعات یافتہ طبقوں کو اقتدار سے محروم کریں گے تو اس وقت حکومت کے انتظام کے لئے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہو گی' اس ضرورت کو ایک چھوٹی جماعت یا چند افراد پورا نہیں کر سکتے' اس لئے کارروائی یا تشدد واقعات پائیدار انقلاب نہیں لا سکتے۔

مارکس کے بعد بورژوا طبقوں میں انقلاب کے بارے میں تبدیلی آئی اور وہ اس کو روکنے کی تدابیر کرنے لگے۔ جب کہ مارکس اور اس کے پیروکار انقلابی جدوجہد کے ذریعہ تبدیلی کی کوشش کرنے لگے۔ جب یورپ میں 1848ء کے انقلاب اور 1871ء میں پیرس کمیون کو ناکامی ہوئی تو اس کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلح جدوجہد کے ذریعہ حکومتوں کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جمہوری طریقوں سے ارتقائی اور پرامن جدوجہد کی جائے۔

لینن نے اس خیال کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے "ریاست اور انقلاب" میں لکھا کہ۔

"ریاست حکمراں طبقوں کا آلہ کار ہے۔ جب تک ریاست موجود ہے مظلوم طبقوں کی کامیابی ناممکن ہے۔ اس لئے انقلاب کے لئے عوام کی پختگی کا انتظار نہیں کرنا چاہئے' بلکہ انقلاب کے لئے ایک خوب تربیت یافتہ اور باشعور جماعت تیار کرنا چاہئے۔"

لینن نے انقلاب کا جو نظریہ پیش کیا اس کے پس منظر میں روس میں زار روس کے خلاف ناکام بغاوتیں اور یورپ میں بڑھتی ہوئی سرمایہ دار طاقتیں تھیں' اور یہ طاقتیں نوآبادیاتی نظام کی وجہ سے اور منظم ہو رہی تھیں۔ لینن نے اس پر زور دیا کہ قلم اور تلوار دونوں کو استعمال کر کے معاشرے کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ پرولتاری طبقوں کے لئے زیادہ طاقت دباؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے' اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ صرف جنگ ہے اس لئے انقلاب دو باتوں پر منحصر ہے۔

1۔ ایک انقلابی جماعت جو منظم ہو اور حکومت پر قبضے کے لئے تیار ہو۔

2۔ سماجی اور سیاسی بحران جو حکمراں طبقوں کو کمزور کر دیں گے اور جس کی وجہ سے انقلابی جماعت کو عوام کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ جب تک نچلے طبقے حکمران طبقوں سے بیزار نہیں ہو جائیں گے اور جب تک حکمراں طبقے بحرانوں پر قابو پانے میں ناکام نہیں ہو جائیں گے' اس وقت تک انقلابی صورت حال پیدا نہیں ہو گی۔

لینن کے نزدیک وہ انقلابی جماعت جو اقتدار پر قبضہ کے لئے تیار ہو' وہ مارکسسٹ پارٹی ہو گی۔ اس نے اپنے مشاہدات کے ذریعہ اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر صنعتی مزدوروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ٹریڈ یونین کی سیاست میں الجھ کر رہ جائیں گے' آگے نہیں بڑھ سکیں گے اور اپنی حالت سدھارنے کے لئے انقلاب سے زیادہ اصلاحات پر زور دیں گے۔ صنعتی مزدوروں اور پرولتاری طبقہ میں انقلابی شعور پیدا کرنے کا کام دانشوروں کا ہے وہ اس کام کو کرنے کے لئے آگے آئیں۔

1902ء تک لینن اس بات کا قائل تھا کہ سوشلسٹ انقلاب کے لئے ضروری نہیں کہ ایسی جماعت بنائی جائے کہ جس میں عوام کا بڑا حصہ شامل ہو۔ بلکہ انقلابیوں کا ایک تربیت یافتہ گروہ جس میں دانشور اور سیاستداں ہوں وہ انقلاب کی راہیں ہموار کر کے انقلاب لا سکتے ہیں۔ مگر اس کے بعد اس کے خیالات میں تبدیلی آئی اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ پارٹی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شامل کیا جائے مگر اختیارات چند لوگوں کے پاس ہی ہوں۔

انقلاب کی راہ میں لینن کے نزدیک امپیریل ازم سب سے بڑی رکاوٹ ہے لہذا انقلابی

قوتیں جن میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی مزدور اور کسان ہیں اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی بورژوا قومی تحریکیں مل کر جدوجہد کریں، اور اسے کمزور کر کے انقلاب کی رکاوٹوں کو دور کریں۔ سرمایہ داری نظام جو بڑی بڑی کمپنیوں اور فرموں پر قائم ہے یہ اپنے ملک میں مزدوروں کو بھی رعایت دے کر ان کا انقلابی کردار ختم کر رہا ہے۔ روس میں جب پرولتاری انقلاب کامیاب ہوا تو لینن نے پہلا کام یہ کیا کہ روس کو امپیریل ازم کے عالمی دائرے سے نکال دیا تاکہ عالمی سرمایہ داری اور امپیریل ازم کا زور ٹوٹ جائے، اور عالمی انقلاب کی راہیں کھل جائیں۔

وقت کی تبدیلی کے ساتھ انقلاب کے نظریات میں بھی تبدیلی آتی گئی، ہر ملک کی حالت کے مطابق انقلابی جدوجہد کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہر سوشلسٹ انقلاب اپنی ذات میں جداگانہ ہوتا ہے، اس کا کوئی ایک نمونہ نہیں ہوتا، اس لئے دوسرے انقلابوں سے تجربہ تو حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن ہر انقلاب اپنے خاص ماحول اور حالات میں پروان چڑھتا ہے اور آگے کی جانب بڑھتا ہے۔ اب تک سوشلسٹ انقلاب جن جن ملکوں میں آیا ہے وہ وہاں علیحدہ خصوصیت کا حامل رہا ہے، لینن نے اس سلسلہ میں واضح طور پر کہا کہ ہر ملک میں جدوجہد کو اس کے حالات کے مطابق تبدیل کرنا چاہئے، مگر ہر انقلاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ سرمایہ داری نظام کو بدلے اور پرولتاری طبقے کو اقتدار میں لائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ملک کو جداگانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیات میں دو قسم کی قومی آزادی کی جنگیں لڑی گئیں: اول وہ جنگیں جو قومی بورژوا طبقے نے قومیت کے نام پر لڑیں۔ یہ جنگیں دستوری، قانونی بنیادوں پر لڑی گئیں اور نوآبادیاتی حکمرانوں نے سمجھوتے کے ذریعہ ان ملکوں کو آزاد کیا تاکہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ آزادی کے بعد وہ ان کے ایجنٹ بن گئے اور انہوں نے نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھ کر عوام کا استحصال جاری رکھا۔

دوسری قسم ان ملکوں کی تھی کہ جہاں جاگیرداری اور امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد کی گئی۔ یہ جدوجہد خونریز اور سخت مقابلہ والی تھی، اس کی مثال چین، ویت نام، موزمبیق، گنی بساؤ اور انگولا ہیں کہ جہاں عوامی جمہوریتیں قائم ہوئیں اور طبقاتی فرق کو ختم کیا گیا۔

اس وقت اکثر ان ملکوں میں جو نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہوئے ہیں، وہاں غیر جمہوری حکومتیں قائم ہیں اور ان کے خلاف انقلابی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں انقلاب کے نظریات میں نہ صرف تبدیلی آئی، بلکہ اس میں وسعت و ہمہ گیریت پیدا ہوئی۔ ان

میں سے اکثر ممالک صنعتی طور پر پس ماندہ ہیں اور ان کے عوام کی اکثریت مفلسی، جہالت اور توہمات کی وجہ سے بہت پیچھے ہے، ان حالات میں انقلابی جدوجہد کس انداز میں شروع کی جائے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے چی گویرا نے اس بات پر زور دیا کہ مقبول قوتیں اور طاقتیں فوج کے خلاف جدوجہد میں کامیاب ہو سکتی ہیں، اس لئے انقلاب کے لئے اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ انقلابی صورت حال تشکیل کو پہنچے، بلکہ ایسی صورت حال کو جدوجہد کے ذریعہ پیدا کرنا چاہئے اور حملوں کے ذریعہ حکومتوں کو کمزور کرنے کا منصوبہ بنانا چاہئے۔ اس کی کامیاب مثال چین اور کیوبا کے انقلابات ہیں کہ جنہوں نے اپنی پس ماندگی کے باوجود انقلابی صورت حال کو پیدا کیا، اور حکومتوں کا تختہ الٹ کر عوامی اقتدار کو قائم کیا۔ اسی منصوبے کے تحت نکاراگوا میں انقلاب آیا اور آمریت کا تختہ الٹا گیا، اور اب یہی جنگ اس وقت فلپائن میں جاری ہے جو ایک طرف حکمراں طبقوں اور دوسری طرف امپیریل ازم سے جدوجہد کر رہی ہے اور اپنے حالات و ماحول کے مطابق انقلابی عمل کو آگے بڑھا رہی ہے۔

اگرچہ مختلف راہنماؤں نے انقلاب کے بارے میں اپنے اپنے نظریات کو پیش کیا ہے مگر تین دانشوروں نے کہ جن میں سے دو نے انقلابی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا انقلاب کے بارے میں جو نظریات پیش کئے وہ مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ یہ فرانز فینن، ریجس ڈیبرے، اور پروفیسر رکودے ہیں۔

فینن کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں شہروں کے پرولتاری، کسانوں اور کاشت کاروں کے مقابلہ میں مراعات یافتہ ہو گئے ہیں اور اس نے ان کا انقلابی کردار ختم کر دیا ہے۔ اس لئے انقلابی محاذ کی تشکیل میں چھوٹے چھوٹے بورژوا طبقوں اور لمپن پرولتاری طبقہ کو ملا کر محاذ بنائیں اور پھر ان کے ذریعہ انقلاب لانے کی جدوجہد کریں۔ افریقہ کا پرولتاری طبقہ انتہائی کمزور ہے اور انقلاب لانے کا اہل نہیں ہے۔ فینن اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ افریقہ سرداروں، جادوگروں، اور مذہبی راہنماؤں کے زیر اثر ہے اور صدیوں کی غلامی، توہمات، جہالت اور مفلسی نے اسے بے حس بنا دیا ہے۔ ان کو اس حالت سے نکالنے اور ان میں شعور پیدا کرنے کے لئے ایک منظم جماعت کی ضرورت ہے۔ چونکہ کسان شہری زندگی کی آلودگیوں سے پاک ہیں اس لئے جب وہ باشعور ہو جائیں گے تو انقلاب کے لئے پرجوش ہو کر جدوجہد کریں گے۔

ڈیبرے نے جو بولیویا میں چی گویرا کے ساتھ تھا اس نے لاطینی امریکہ کے مخصوص حالات میں انقلاب کا جو نظریہ پیش کیا اس کے مطابق لاطینی امریکہ کے کسان خاموش اور بے

عمل ہیں اور یہ انقلاب کے لئے طاقت نہیں بن سکتے۔ قومی بورژوا طبقہ بھی اپنے مراعاتی کردار کی وجہ سے انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ پرولتاری اور مزدور شہری زندگی کی بدعنوانیوں میں ملوث ہو گئے ہیں' اس لئے صرف طالب علم اور دانشور انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں' اور یہی کسانوں کو ان کی بے حسی سے نکال کر انہیں باعمل بنا سکتے ہیں۔
لاطینی امریکہ میں ہر قسم کی جدوجہد ٹھیک نہیں' بلکہ صرف گوریلا جدوجہد ہی اس ماحول میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ جس میں سیاسی و فوجی کمانڈ کا اتحاد ہو' یہ محدود گوریلا جدوجہد اچانک ہو' کیونکہ اچانک حملوں اور سرگرمیوں کی وجہ سے عوام کی اکثریت جو بے حس ہے' اس میں شعور آئے گا' اور چند باعمل انقلابیوں کی حرکت انہیں مجبور کر کے بیدار کر دے گی۔

پروفیسر مارکوزے نے امریکہ اور یورپ کے پس منظر میں اس بات پر زور دیا کہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں مزدور طبقہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک حصہ بن گیا ہے اور اس کے بعد سے اس کا انقلابی کردار ختم ہو گیا ہے' اب یہ کام لمپن پرولتاری ہی کر سکتے ہیں مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب ان کی تربیت کا کام دانشور اور طالب علم کریں۔ مارکوزے کے ان خیالات نے 1960ء کی دہائی میں امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں طالب علموں کی انقلابی تحریک کا آغاز کیا جس کی وجہ سے ان میں اور یونیورسٹیوں میں نصاب کی ساخت اور انتظامیہ کے ڈھانچے میں تبدیلیاں کیں۔

انقلابی نظریات نے کچلے ہوئے مظلوم عوام میں چاہے وہ ایشیا میں ہوں' یا افریقہ میں' مستقبل کے لئے ایک امید پیدا کر دی کہ وہ ظلم و استحصال سے لڑ کر معاشرہ کو تبدیل کر سکتے ہیں اور یہ تبدیلی انقلاب کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

نئی ٹیکنیکل اور فنی ایجادات نے بھی انقلاب دشمن طاقتوں کو مضبوط کیا ہے۔ ان کا استعمال امریکہ نے ویت نام میں گوریلاؤں کے خلاف کیا' ان میں وہ حساس آلے تھے کہ جن کے ذریعہ ان کے خفیہ ٹھکانوں کا پتہ چلا لیا گیا اور پھر ان پر حملہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ انقلاب کو روکنے کے لئے پولیس' فوج' جاسوسی محکموں کے ادارے ہوتے ہیں' تحریر و تقریر پر پابندی اور سنسرشپ وہ تدبیریں ہوتی ہیں کہ جن کے ذریعہ لوگوں تک نئے خیالات کو پہنچنے سے روکا جاتا ہے' اس کے بعد ایذا' تشدد' اور دہشت گردی ہوتی ہے جس کے ذریعہ انقلاب کے کارکنوں کی جسمانی اور روحانی قوت کو توڑا جاتا ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں مل کر انقلاب کی راہ کو روک سکتی ہیں؟ تاریخ کا جواب ہے نہیں!!

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انقلاب کیوں آتا ہے؟ کیوں نیچے طبقے ابھرتے

ہیں جو انقلاب کے لئے جدوجہد کرتے ہیں؟ آخر کیوں لوگ اصولوں کی خاطر اپنی جان اور مال کو قربان کر دیتے ہیں؟ جب بھی معاشرے میں سماجی تضادات بڑھ جاتے ہیں' عوام اور نچلے طبقوں کی حالت خراب ہو جاتی ہے' معاشی بحران' قومی و لسانی جھگڑے معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں' لاقانونیت و بدعنوانی بڑھ جاتی ہے' حکومتی ادارے بحرانوں پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں اور معاشرہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے' تو اس صورت میں حکمران طبقوں کا پہلا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اصلاحات کے ذریعہ معاشرہ کی اس ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کو روکا جا سکتا ہے لیکن ان اصلاحات میں اقتدار پرانے طبقوں کے پاس ہی رہتا ہے اور وہ معاشرہ کی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی آنے نہیں دیتے' اس لئے اصلاحات کے کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ بعض اوقات حکمران طبقے نظام میں کسی بھی قسم کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے یا وہ ذہنی طور پر اس قدر پسماندہ ہوتے ہیں کہ اس میں اصلاح کرنے کی اہمیت ہی نہیں سمجھتے اور نظام اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس صورت حال میں سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں بچتا کہ انقلاب کے ذریعہ نظام کو تبدیل کیا جائے۔ یہ صورت حال اس وقت جنوبی افریقہ اور اسرائیل میں ہے کہ جہاں افریقیوں اور فلسطینیوں کے حقوق کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں اور اس لئے ان کے خلاف جدوجہد سخت اور پر تشدد ہے۔ ماضی میں اسی صورت حال سے روس دوچار تھا کہ جہاں زار نے اصلاحات سے انکار کر دیا تھا' اور چین کے جاگیردار بھی اپنے نظام کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں تھے۔ یہی صورتحال نے افریقہ میں پرتگالی نوآبادیات میں انقلاب کو پیدا کیا کیونکہ پرتگال اپنی مراعات چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

جب حقوق و معاش سے محروم لوگ متحد ہو کر نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی پرامن جدوجہد کے کوئی نتائج نہیں نکلتے' اور ان کے مطالبات کا کوئی اثر نہیں ہوتا' تو اس صورت میں وہ اپنے حقوق کے لئے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جب ان میں اور حکمران طبقوں میں تصادم ہوتا ہے تو منطقی طور پر حکمران طبقے تشدد کے ذریعہ ان کی ہر تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں' مگر جس قدر تشدد ہوتا ہے اسی قدر مزاحمت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اسی قدر تحریک میں عوام کی اکثریت شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حکمران طبقے تنہا ہو جاتے ہیں' اور ان کے تشدد کے ادارے فوج و پولیس و انتظامیہ کمزور ہو جاتی ہے' اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب انقلابی جماعت اس پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس وجہ سے بڑے انقلابات ان ملکوں میں آئے جو سماجی طور پر پسماندہ تھے اور جہاں

طبقاتی فرق بہت زیادہ تھا، جیسے روس، چین، کیوبا، ویت نام، نکاراگوا، اور افریقہ میں پرتگالی نو آبادیات۔ ان ملکوں میں دولت اور مراعات چند طبقوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور دوسرے طبقوں میں باصلاحیت افراد کی ترقی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ دولت تو حکمراں طبقوں کے پاس تھی مگر حکومت کا خزانہ خالی تھا اس لئے اخراجات کے لئے عوام پر ٹیکسوں میں اضافہ ہوا، اور جب اس کے نتیجہ میں عوام میں بے چینی پیدا ہوئی تو اسے روکنے کے لئے سخت قوانین کا نفاذ کیا گیا، تحریر و تقریر پر پابندیاں عائد کی گئیں، مخالفت کو دبانے کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو ذریعہ بنایا گیا، مگر جب ملک میں ایک بار بدامنی ہو جائے اور حکومتی ادارے انہیں ختم کرنے میں ناکام ہو جائیں تو اس سے ان کا وقار عوام کی نظروں میں ختم ہو جاتا ہے، اور ان میں مخالفت کے جذبات زیادہ زور پکڑ جاتے ہیں یہی کچھ ان ملکوں میں ہوا انقلابی قوتوں کے خلاف حکومتوں نے طاقت کا استعمال کیا، اور جب اس میں انہیں ناکامی ہوئی تو اس سے انقلابی تحریک کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوتی چلی گئیں۔

ایک مرتبہ جب انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ قدیم نظام کی ہر چیز کو مٹا دے اور پرانی یادوں کو بالکل فراموش کر دے۔ اس لئے قدیم نظام، اس کے اداروں، اور روایات کو تہس نہس کر دیا جاتا ہے، اور نئے نظام کی بنیاد نئے اقدار میں استوار کی جاتی ہے، اور زندگی کے ہر پہلو میں نئی ابتداء کے ساتھ کام کیا جاتا ہے۔ حکمراں اور مراعاتی طبقوں کا زوال ہوتا ہے، اور سیاسی و معاشی، اور معاشرتی اصلاحات کے ذریعہ بنیادی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں، اور نئے نظام کی تشکیل میں عوام کی اکثریت شریک ہوتی ہے، کیونکہ وہ انقلابی عمل سے گزر چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کا شعور اور جذبہ نئے نظام کو توانائی دیتا ہے۔

انقلاب سے صرف ایک ہی سرزمین اور ملک متاثر نہیں ہوتا، بلکہ اس سے اس کے ہمسایہ اور دوسرے ملک بھی متاثر ہوتے ہیں، اور انقلاب کے خوف سے یا تو حکمران طبقے اصلاحات کا سہارا لیتے ہیں ۔۔۔ یا تشدد کے ذریعہ اپنے اقتدار کا تحفظ کرتے ہیں، لیکن ان دونوں صورتوں میں معاشروں میں تبدیلی ہوتی ہے۔

فرانسیسی انقلاب

دنیا کی تاریخ میں فرانسیسی انقلاب اپنے اثرات کی وجہ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس انقلاب نے معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ قدیم نظام کا نام و نشان مٹا دیا، اور اس کی جگہ نئے اداروں اور روایات کی بنیادیں ڈالیں۔ یہ انقلاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ فرانس میں آیا جو کہ یورپ میں تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا اور جہاں علم و دانشوری کی روایات بڑی گہری تھیں۔ اس وجہ سے اس انقلاب نے اپنے ہمسایہ ملکوں کو فوراً ہی متاثر کیا، اور انقلاب کے دوران اور اس کے بعد بیس سال تک یورپ میں جو جنگیں ہوئیں۔ اس نے یورپ کی تاریخ کو بدل ڈالا۔

فرانس میں یہ انقلاب کیوں آیا؟ ٹوک ویل نے اس مسئلہ میں ایک دوسرا ہی نقطہ نظر دیا ہے کہ انقلاب ہمیشہ ظلم و دباؤ اور احساس محرومی ہی کی وجہ سے نہیں آتے ہیں بلکہ یہ اس وقت بھی آتے ہیں جب معاشرہ میں خوشحالی آجاتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ انقلاب سے پہلے کسانوں کی حالت بہتر تھی، اور حکومت مسائل کے حل کے لیے اصلاحات کرنا چاہتی تھی۔ اصلاحات کی ابتدا کر کے حکومت نے خود اپنے مستحکم اور قائم شدہ نظام کو توڑ دیا اور انقلابی راہیں ہموار کر دیں۔ کیونکہ جب لوگ حکومت کے ظلم و استحصال کا شکار ہوتے ہیں تو بے بسی کے ساتھ ہر ظلم کو برداشت کرتے ہیں لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ حکومت کی سختی کم ہو رہی ہے اور وہ مراعات دینے پر تیار ہے، تو وہ اس کے خلاف ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کے مطالبات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور حکومت کی ہر اصلاح اور مطالبات کو ماننا اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی وقعت عوام کی نظروں میں گرتی جاتی ہے۔ اس لئے ٹوک ویل کے نزدیک حکومت کی اصلاحات نے فرانسیسی انقلاب کو پیدا کیا۔

فرانسیسی انقلاب کے پس منظر میں فرانس کے سماجی و معاشی اور سیاسی عوامل کار فرما تھے جو آہستہ آہستہ اس کے معاشرتی ڈھانچہ میں تبدیلیاں لا رہے تھے۔ اٹھارویں صدی تک فرانس میں امراء اور جاگیردار جو زمینوں کے مالک تھے، وہ ملک کے تمام مادی اور مالی وسائل پر قابض تھے۔ جو لوگ زمین سے محروم تھے وہ ان پر انحصار کرتے تھے اور ان کے ملازم ہوا کرتے

تھے۔

لیکن جب معاشرہ میں تبدیلی آئی اور تجارتی طبقہ ابھرنا شروع ہوا تو اس نے زراعت سے ہٹ کر تجارت، لین دین، اور صنعت و حرفت میں اپنی ذہانت کو استعمال کرنا شروع کیا، اور بہت جلد یہ طبقہ شہروں پر قابض ہو گیا۔ اس طبقہ میں ڈاکٹر، وکیل، تاجر، بنکار، دستکار، ساہو کار، اور ہنر مند شامل تھے، چونکہ اس طبقہ کی پشت پر کوئی جاگیر اور جائداد نہیں تھی، اس لئے انہوں نے اپنے اپنے پیشوں میں سخت محنت و مشقت کی اور خود کو مالی لحاظ سے بہت جلد مستحکم کر لیا، یہاں تک کہ اقتصادی خسارے اور مالی بحران میں یہ شاہی خزانے کو قرضے دیا کرتے تھے۔

جس وقت متوسط طبقہ اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے ابھر رہا تھا اور معاشرہ میں اہم مقام حاصل کر رہا تھا، اس وقت جاگیردار طبقہ بے عملی اور اسراف کی وجہ سے زوال پذیر تھا. کسانوں کی بدحالی کی وجہ سے زراعتی ترقی متاثر ہو رہی تھی۔ چرچ جو زمینوں پر قابض تھا اس نے بھی اپنے طریقِ کار اور کسانوں کے استحصال کی وجہ سے زرعی پیداوار کو متاثر کیا۔ اور جب زرعی پیداوار گھٹی، اور جاگیرداروں کی آمدنی کم ہوئی تو اس نے ان کے اخراجات پر اثر ڈالا مگر ان کی زندگی میں جو اسراف تھا، اور ان کا نقطۂ نظر جس طرح سے تنگ اور محدود تھا اس میں ان کے لئے اس نظام سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس لئے وہ ہر حالت میں اسی نظام میں رہ کر اپنی مراعات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ان حالات میں بورژوا طبقہ اپنی محنت اور ذہانت سے معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کے حصول میں قانون، روایات، اور اقتدار اس کی راہ میں حائل تھیں اور اس کے آگے بڑھنے کے تمام راستے بند تھے، اس لئے فرانسیسی انقلاب اس طبقہ کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوا، اور اس نے اس سے فائدہ اٹھا کر حکومت و سیاست کے ہر ادارے، اور روایت کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے شہر کے نچلے طبقوں، اور دیہات کے کسانوں کو استعمال کیا، جنہوں نے انقلاب کی کامیابی کے نتیجہ میں ظلم و ستم اور استحصال کے خاتمہ کی امید کی، ان کی شمولیت کے بغیر یہ انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

فرانسیسی مورخ لے فے بورے نے فرانسیسی انقلاب کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا ہے: اس کی ابتداء بادشاہ پر امراء کے دباؤ سے شروع ہوئی 1788ء میں انہوں نے کوشش کی کہ بادشاہ کی طاقت کو کم کر کے اپنے اختیارات کو بڑھا لیں، اس عمل نے بورژوا انقلاب کی راہیں ہموار کیں، اس کے بعد شہروں اور دیہاتوں میں عوام نے انقلاب برپا کیا، اور سب سے آخر میں یہ

کسانوں کے انقلاب پر ختم ہوا، اور اسی پر فرانسیسی انقلاب مکمل ہوا۔

فرانسیسی انقلاب کو سمجھنے کے لئے فرانس کے قدیم نظام، اور اس کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ فرانس میں بادشاہت کا ادارہ بڑا مضبوط اور مستحکم تھا۔ اس کا اظہار لوئی چہاردہم کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ "میں ریاست ہوں" عوام میں بادشاہ کی حیثیت ارفع و اعلیٰ تھی، شاہی الوہیت کا نظریہ مستحکم تھا اور تمام اختیارات سمٹ کر بادشاہ کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔

فرانس کے دارالسلطنت ورسائی میں بادشاہ کی شان و شوکت اور عظمت کی علامتیں موجود تھیں۔ شاندار شاہی محل، دربار کی رونقیں، دعوتیں، ناچ و رقص کی محفلیں، سیر و تفریح، شکار، اور روز مرہ کے معمولات نے اس شہر کو ثقافت و تمدن کا مرکز بنا دیا تھا اور یورپ کے دوسرے حکمراں ورسائی کے دربار کی تقلید میں لگے ہوئے تھے۔

ایک زمانہ میں فرانس کے امراء اور جاگیردار بڑے اختیارات رکھتے تھے، اور عام طور سے یہ دیہاتوں میں اپنی بڑی بڑی حویلیوں اور قلعوں میں خود مختارانہ زندگی گزارتے تھے، مگر بادشاہ کی مطلق العنانیت کی وجہ سے ان کی قوت و طاقت بھی کمزور ہوئی، اور ان میں سے جو امراء بادشاہ کے قریب تھے اور جنہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے دیئے گئے تھے وہ اپنی حویلیوں سے نکل کر ورسائی میں آ بسے اور دربار میں رہ کر بادشاہ کی خوشامد میں مصروف ہو گئے۔

طاقت کے اس طرح سے ایک مرکز پر جمع ہونے کے کئی نقصانات ہوئے کیونکہ جب تک بادشاہ کی شخصیت ذہین اور متحرک رہی وہ ان اختیارات کو استعمال کر کے موثر طور پر حکومت کا بندوبست کرتا رہا، مگر موروثی طرز حکومت میں ہر شخص ذہین اور باصلاحیت نہیں ہوتا ہے اور اس میں نااہلوں کو بھی حکومت کرنے کا حق ملتا ہے، اور جب یہ تخت پر بیٹھتے ہیں تو حکومت کے سارے نظام اور معاملات کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یہی کچھ فرانس میں ہوا، لوئی چہاردہم کے بعد جو بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ انتہائی کمزور اور صلاحیتوں سے محروم تھے، اور ان میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ بدلتے ہوئے حالات کو سمجھتے اور خرابیوں کو دور کر کے معاملات کو بہتر بناتے۔ اس لئے ریاست میں خرابی کی ابتداء اقتصادی بحرانوں سے ہوئی۔

ورسائی کے دربار میں بادشاہ اور اس کے امراء کے اخراجات دن بدن بڑھ رہے تھے۔ کیونکہ اب دربار میں کچھ کرنے کو نہیں ہوتا تھا تو فرصت کے اوقات میں اور وقت گزاری کے لئے دعوتیں، رقص و سرود کی محفلیں، اور شکار کی مہمات ہوا کرتی تھیں۔ خواتین اور مردوں میں لباس و زیورات اور دوسرے لوازمات کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ آئے دن نت

نئے فیشنوں کا رواج ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھتے گئے۔ یہ ایسے اخراجات تھے کہ جن کا تعلق نہ ملک کی ترقی سے تھا اور نہ عوام کی فلاح و بہبود سے۔ جب اخراجات کی تعداد بڑھی اور ملک کی آمدنی کے ذرائع سے انہیں پورا نہیں کیا جا سکا تو پھر قرضے لے کر ان اخراجات کو پورا کیا جانے لگا' جس کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک آئی کہ ریاست کی آدھی آمدنی قرضے کے سود میں چلی جاتی تھی۔

فرانس کا دوسرا بڑا خرچہ فوجی اخراجات کا تھا' ہمسایہ ملکوں کے حملوں کے خوف کی وجہ سے ایک بڑی فوج رکھی جاتی تھی' یہ فوج نہ صرف دشمنوں سے جنگ میں کام آتی تھی بلکہ اس سے اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بھی کچلا جاتا تھا۔

ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکسوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا گیا' ستم بالائے ستم یہ کہ ٹیکسوں کے اس نظام میں مراعات یافتہ طبقوں کو بالکل چھوٹ ملی ہوئی تھی' ان میں سے بعض بہت کم ٹیکس دیتے تھے اور بعض بالکل نہیں دیتے تھے' اس طرح سے سارا بوجھ عوام پر تھا جو پہلے ہی سے مالی طور پر بدحال تھے۔ اس وجہ سے جب ان لوگوں سے ٹیکس لئے جائیں گے جن کے پاس پیسہ کوڑی بھی نہیں ہو گا' اور وہ لوگ معاف کر دیئے جائیں گے کہ جو جائیداد و مال و دولت رکھنے والے ہیں تو اس صورت میں آمدنی کا کم ہو جانا فطری بات ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں ریاست کی آمدنی کا ایک ذریعہ سرکاری عہدوں کی فروخت ہوتی تھی' مگر بعد میں جب یہ عہدے موروثی ہو گئے تو آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ زراعتی آمدنی جو حکومت کا سب سے اہم ذریعہ تھا' اس کی صورت حال یہ تھی کہ امراء کے پاس زمین 25 فیصد حصہ تھا' 10 فیصد پہ چرچ قابض تھا اور یہ دونوں زمین کے لگان یا مالیہ دینے سے معاف تھے۔ اس طرح زراعتی ٹیکس کا سارا بوجھ چھوٹے کاشت کاروں پر آپڑا تھا۔

آمدنی کا دوسرا بڑا ذریعہ تجارت اور صنعت و حرفت تھی مگر اس کی ترقی اور فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ ملک میں پھیلے ہوئے ناکہ و چنگی کے اڈے تھے جو حکومت کی طرف سے قائم تھے۔ یہاں پر بھی ٹیکس وصول کرنے کا انتظام انتہائی ناقص تھا اور عام طور سے انہیں ٹھیکہ پر دیدیا جاتا تھا جس کی وجہ سے بدعنوانی اور رشوت کا عام رواج ہو گیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے درمیان ٹیکس کے اس نظام کو بہتر بنانے کے لئے اصلاحات کی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ مراعات یافتہ طبقوں سے ٹیکس وصول کیا جائے' اور آمدنی بڑھانے کی خاطر تجارت پر جو اندرونی رکاوٹیں ہیں۔ انہیں دور کیا جائے۔

اس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ امراء کو جو مراعات ملی ہوئی تھیں وہ وقت کے ساتھ ان کے لئے باعث امتیاز اور فخر ہو گئیں' ٹیکس نہ دینا ان کے طبقہ کے لئے ایک ایسی مراعات تھی کہ اس سے دستبردار ہونے کے لئے وہ تیار نہ تھے کیونکہ کسی بھی ایک مراعات کو کھونے کا مطلب تھا کہ اپنے طبقہ کی عزت و وقار کو کم کر دیا' اور خود کو نچلے طبقوں سے منسلک کر دیا۔ اس کے علاوہ ایسے جاگیرداروں اور امراء کی بھی کمی نہ تھی جو وقت کے ہاتھوں زوال پذیر ہو چکے تھے اور خستہ حویلیوں میں گرتی ہوئی دیواروں کے درمیان معاشی دباؤ کے تحت خاموشی سے وقت گزار رہے تھے۔ ان کے لئے ٹیکس دینا ایک مالی بوجھ تھا جسے برداشت کرنے پر وہ تیار نہیں تھے۔

امراء کا طبقہ بحیثیت مجموعی اس لئے بھی بادشاہ کا مخالف تھا کہ اس نے مطلق العنانیت کے ذریعہ ان کے تمام اختیارات کو ختم کر دیا تھا' اس لئے وہ اس نظام کی اصلاح میں اس کے ساتھ تعاون کر کے اسے مضبوط نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اس موقع کے منتظر تھے کہ اگر بادشاہ کمزور ہو تو وہ دوبارہ سے اپنے چھنے ہوئے اختیارات کو حاصل کر لیں۔ چنانچہ 1780ء کی دہائی میں انہوں نے بادشاہ کی مالی حالت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اختیارات کو بڑھانا چاہا اور اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کے ادارے کے احیاء کی کوشش کی۔

فرانس کے سیاسی نظام میں ہر علاقے کی ایک پارلیمنٹ ہوا کرتی تھی کہ جس کے رکن امراء ہوا کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم پارلیمنٹ پیرس کی تھی۔ یہ ایک قانون ساز ادارہ تھا اور اس کے ذریعہ سے ہی قانون کی منظوری لی جاتی تھی' اگرچہ بادشاہ کو ویٹو کا اختیار تھا مگر اس کے باوجود اس پر اس کا شدید دباؤ ہوا کرتا تھا' لہذا امراء نے پارلیمنٹ کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کو بڑھانا چاہا' سب سے پہلے تو انہوں نے امراء پر ٹیکس لگانے کی مخالفت کی' پھر بادشاہ کی مطلق العنانیت کو کم کرنے کی خاطر انہوں نے دستوری حقوق اور آزادی کے مطالبات کئے' اگرچہ جب وہ آزادی کہتے تھے تو اس سے ان کا مطلب صرف اپنی آزادی ہوتا تھا' اور جب وہ نمائندہ اداروں کی بات کرتے تھے تو اس سے صرف اپنی نمائندگی چاہتے تھے' مگر یہ نعرے ایسے تھے کہ انہوں نے عام آدمی کو متاثر کیا اور انہیں بادشاہ کی مطلق العنانیت کے خلاف متحرک کیا۔ اس طرح سب سے پہلے امراء نے اپنے مفاد کی خاطر جو تحریک شروع کی اس نے فرانس کے ٹھہرے ہوئے نظام میں ہلچل پیدا کر دی اور اسی سے تبدیلی کا آغاز ہوا۔

معاشرتی لحاظ سے فرانس تین طبقوں میں بٹا ہوا تھا' امراء' چرچ کے عہدے دار اور عوام جنہیں "تھرڈ اسٹیٹ" کہا جاتا تھا۔ امراء کا طبقہ مراعات یافتہ تھا' انہیں ٹیکسوں سے معافی تھی' اپنی جاگیروں میں یہ عدالتی اختیارات کے حامل تھے اور اپنی جاگیر کی حدود میں یہ خود ٹیکس وصول

کیا کرتے تھے۔ امراء کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک امراء شمشیر کہلاتے تھے یہ فرانس کے قدیم امراء تھے، دوسرے امراء خلعت کہلاتے تھے، اور حکومت کے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔

امراء کی تعداد تقریباً 4 لاکھ کے قریب تھی، چونکہ یہ ایک مراعات یافتہ طبقہ تھا اس لئے انہوں نے اپنے طبقہ کو دوسروں کے لئے بالکل بند کر دیا تھا، اور کسی کے لئے طبقہ امراء میں شامل ہونا بڑا مشکل تھا۔ اپنے طبقہ کے اقتدار، رعب، وقار کو قائم رکھنے کے لئے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حکومت کے تمام اعلیٰ عہدوں پر ان کا قبضہ ہو، تاکہ کوئی دوسرا ان کے مقابلہ میں آ نہ سکے۔ اس لئے 1781ء کے فوج کے تمام بڑے عہدوں پر صرف امراء کا تقرر ہوا کرتا تھا اور ریاست کے اعلیٰ عہدے بھی انہیں کو ملا کرتے تھے۔ بادشاہ کے تمام وزراء اور انتظامیہ کے عہدے دار طبقہ امراء سے ہی لئے جاتے تھے۔

چونکہ چرچ کے پاس بھی بڑی بڑی جاگیریں تھیں، اس لئے اس کے بڑے عہدے دار بھی اپنی مراعات اور حیثیت کی وجہ سے طبقہ امراء میں شامل ہو گئے تھے، صرف چرچ کے چھوٹے عہدے دار جو کہ ان مراعات سے محروم تھے وہ عوام کے ساتھ تھے۔

ان دو طبقوں کے بعد تیسرا طبقہ عوام کا تھا کہ جس میں ابھرتا ہوا متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک غیر مراعاتی طبقہ تھا، اور آبادی کا تقریباً 95 فیصد حصہ تھا۔ متوسط طبقہ صنعت و حرفت و تجارت سے متعلق تھا، اور ان کی دولت و طاقت میں اس وقت اضافہ ہونا شروع ہوا، جبکہ پندرھویں صدی میں جغرافیائی راستوں کی دریافت کے بعد غیر ملکی تجارت کو فروغ ہوا، اور متوسط طبقہ کا اثر و رسوخ بڑے بڑے شہروں پر ہو گیا جہاں وہ جاگیرداروں کے تسلط سے آزاد اپنے پیشوں میں مصروف ہو گیا۔ جب فرانس نے سمندر پار اپنی نوآبادیات کو قائم کرنا شروع کیا تو اس نے تجارت کو مزید بڑھایا۔ اس کی وجہ سے صنعتی پیداوار بڑھی، چیزوں کی قیمتیں بڑھیں، اور تاجر طبقہ طاقتور ہوا۔ اس دوران میں تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے "مارسیلز"، "نانتے" اور "بورڈو" اہم تجارتی بندرگاہیں بن گئیں۔ مال و دولت نے شہروں کی وسعت اور خوبصورتی کو بڑھایا اور بڑی بڑی عمارتیں، باغات، شاہراہیں تاجر طبقہ کی خوش حالی کی علامت بن گئیں۔ لیکن متوسط طبقہ نے ساتھ ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قدیم نظام اور اس کے ادارے ہیں، جو نہ صرف حکومت اور انتظامیہ میں انہیں شامل نہیں ہونے دیتے، بلکہ معاشرے میں انہیں باعزت مقام بھی حاصل نہیں کرنے دیتے۔

متوسط طبقے میں کئی درجے تھے: سب سے زیادہ باعمل اور فعال طبقہ تاجروں کا تھا جن کے پاس مال و دولت جمع ہو گئی تھی، اور اب وہ یہ برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے کہ انہیں معاشرہ

میں حقیر گردانا جائے۔ یہ لوگ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے بڑے خواہش مند تھے اور تجارت میں جو رکاوٹیں اور دقتیں تھیں یہ انہیں ہر قیمت پر دور کرنا چاہتے تھے۔ یہ جب ہی ممکن تھا کہ قدیم نظام کو بدلیں، اور اس کے بجائے نئے نظام کو لائیں کہ جس میں یہ اقتدار میں ہوں۔ دوسرے طبقے میں انتظامی عہدے دار، وکیل، ڈاکٹر، اساتذہ، اور دانشور آتے تھے، جن کے پاس دولت تو نہیں تھی مگر ذہانت اور صلاحیت تھی۔ ذہنی طور پر یہ لوگ روشن خیال اور ترقی پسند تھے اس لئے قدیم نظام کی آلودگیوں سے بیزار رہے۔ اسی طبقہ نے انقلاب کے دوران راہنما کے فرائض انجام دیئے اور نئے نظام کی تشکیل میں حصہ لیا۔

اس طرح سے فرانس کا یہ متوسط طبقہ دولت و شعور دونوں کا مالک تھا۔ وہ قدیم نظام اور اس کے اداروں کے سخت مخالف تھے کیونکہ انہوں نے ان کے اقتدار کی راہیں روک رکھی تھیں، اور ان کی سماجی و سیاسی حالت کو کمتر بنا رکھا تھا۔ اگرچہ ان میں سے کئی اپنی دولت کے سہارے بڑے عہدے خرید لیتے تھے، جاگیرداروں اور امراء کے طبقے میں شادیاں کر کے، اور زمین خرید کر جاگیردار بن جایا کرتے تھے، مگر ان کی یہ سماجی حیثیت انہیں ان کے طبقہ میں شامل ہو کر ملا کرتی تھی، بحیثیت متوسط طبقہ کے، دولت اور ذہانت کے باوجود سماجی طور پر عزت نہیں حاصل کر سکتے تھے۔

متوسط طبقہ کے بعد عام شہری آبادی اور کسان تھے۔ پیرس کا شہر جس نے انقلاب میں نمایاں حصہ لیا، اس کی آبادی اس وقت چھ لاکھ تھی جن میں چھوٹے تاجر، دکاندار، مزدور اور گھریلو ملازمین شامل تھے۔ اس وقت تک چونکہ صنعتی انقلاب نہیں آیا تھا، اس لئے مزدوروں کی کوئی جماعت نہیں تھی، اور چھوٹی فیکٹریوں میں مالک اور مزدور مل کر کام کیا کرتے تھے۔ شہروں کی عام آبادی چونکہ انتہائی غریب تھی اس لئے قیمتوں میں ذرا سا اضافہ ان کے لئے معاشی مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ خصوصیت سے روٹی کی قیمت میں اضافہ ہنگامہ کا سبب بن جاتا تھا کیونکہ اس وقت آج کے مقابلہ میں فرانس میں روٹی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔

ملک کی 80 فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی، جو اگرچہ جاگیرداروں کے غلام تو نہیں تھے مگر ان کے دست نگر تھے۔ ان میں کچھ تھوڑی بہت زمین کے مالک ہوا کرتے تھے، کچھ حصہ داری پر کاشت کاری کرتے تھے۔ مگر اکثریت کھیت مزدوروں کی تھی۔ اٹھارویں صدی میں جب آبادی میں اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی زمین سے محروم کسانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اسی طبقہ کو سب سے زیادہ ٹیکسوں کی ادائیگی کرنا پڑتی تھی۔ ایک طرف یہ چرچ کو مذہبی ٹیکس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف حکومت اور زمینداروں کے ٹیکس بھی انہیں کو ادا کرنا پڑتے تھے اس لئے یہ

طبقہ معاشی طور پر سب سے زیادہ بدحال تھا اور تبدیلی کی خواہش سب سے زیادہ اسی میں تھی۔

اس ماحول میں فرانس کے دانشوروں نے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قدیم نظام کی خرابیوں کو اور اس کی عیبوں کو ظاہر کر کے اس کی روایات پر حملے کئے۔ خصوصیت سے چرچ اور مذہبی عقائد ان کے حملوں کا نشانہ بنے' اس نے جہاں قدیم نظام کو کمزور کیا' وہاں لوگوں میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کے خیالات کو بھی ترقی دی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ لوگوں کو مکمل آزادی ملنی چاہئے کیونکہ صرف اس کے بعد ہی وہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور ترقی کر سکتے ہیں۔ ان دانشوروں میں والٹیر اور روسو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کی تحریروں نے انقلاب کے راہنماؤں کو متاثر کیا۔

ان حالات میں 1774ء میں لوئی سولہ تخت نشین ہوا۔ لوئی سیاسی معاملات میں کوئی صلاحیت نہیں رکھتا تھا' اور یہی اس کی ملکہ میری انتونیت کا حال تھا۔ تخت نشینی کے فوراً بعد لوئی کی حکومت کو مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا اور اس کو دور کرنے کی ذمہ داری ترگوت کے سپرد کی گئی جو کہ خزانہ کا ڈائریکٹر مقرر ہوا' ترگوت حکومت کے مالی نظام کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کی حیثیت میں نہیں تھا اس لئے وہ صرف اصلاحات کے ذریعہ اس میں کچھ تبدیلیاں لا سکتا تھا' لہٰذا اس نے دو اصلاحات پر زور دیا:

1. چنگی ختم کر کے اندرون ملک تجارت پر جو پابندیاں ہیں' انہیں ختم کیا جائے۔
2. تمام جاگیرداری پر مالیہ نافذ کیا جائے۔

اس پر جاگیرداروں اور امراء کی جانب سے اس کی سخت مخالفت ہوئی جس کے سبب 1776ء میں اسے ہٹا دیا گیا۔ جب مراعات یافتہ طبقہ اپنی مراعات کو ذرا بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا تو حکومت کی مالی حالت اور خراب ہوئی اور اس خرابی کے ساتھ ہی بادشاہ کے اختیارات اور اس کی حیثیت متاثر ہوئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر امراء نے اس بات کی کوشش کی کہ انہیں اقتدار میں اور زیادہ شریک کیا جائے۔

ترگوت کے بعد مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ایک دوسرے شخص نیکر کو یہ ذمہ داری دی گئی اس وقت صورت حال یہ تھی کہ قرضہ پر سود کی رقم بہت زیادہ بڑھ چکی تھی' لہٰذا اس کے سامنے مالی اصلاحات کے تین راستے تھے: اخراجات میں کمی کی جائے' مزید قرضے لے کر اخراجات پورے کئے جائیں' یا ٹیکسوں میں اضافے کئے جائیں۔ لیکن ٹیکس نظام کو اگر ذرا بھی بدلا جاتا تو اس سے متاثر ہونے والا طبقہ امراء کا تھا جو اس پر بالکل تیار نہیں تھے کہ ان پر کسی بھی قسم کا ٹیکس لگایا جائے۔

چونکہ زرعی ٹیکس لگانے کا فیصلہ اسٹیٹ جنرل' فرانس کا دستور ساز ادارہ ہی کر سکتا تھا' اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کا اجلاس بلایا جائے' اور اس میں بنیادی نوعیت کے فیصلے کرائے جائیں۔ اس ادارے کا آخری اجلاس 1614ء میں ہوا تھا' اور اس کے بعد سے اس کا اجلاس بلایا ہی نہیں گیا تھا' مگر اب حالات سے مجبور ہو کر مئی 1789ء کو اس کا اجلاس بلایا گیا۔ امراء کو اس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ بادشاہ کی مطلق العنانیت کو ختم کر کے اپنے اختیارات بڑھانا چاہتے تھے۔

تھرڈ اسٹیٹ (عوام) کو 1788ء میں پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ امراء اس طرح سے اپنا اقتدار مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور کسی بھی صورت میں اپنی مراعات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہیں' اس لئے انہوں نے جہاں ایک طرف بادشاہ کی مطلق العنانیت کی مخالفت کی' وہاں دوسری طرف امراء کے اختیارات کے خلاف بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اسٹیٹ جنرل کے اجلاس کے سلسلہ میں سب سے پہلے جھگڑے کی ابتداء اس سے ہوئی کہ کیا اجلاس قدیم روایات پر ہو یا اس میں تبدیلی کی جائے؟ کیونکہ قدیم روایات کے تحت تھرڈ اسٹیٹ کے نمائندوں کی حیثیت امراء اور چرچ کے مقابلہ میں کمتر تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ مطالبات پیش کئے کہ اسٹیٹ جنرل میں ان کے نمائندوں کی بھی تعداد اسی قدر ہونی چاہئے جس قدر کہ امراء اور چرچ کے ہوتے ہیں۔ تینوں طبقوں کے نمائندوں کا اجلاس ایک ہی جگہ پر ہونا چاہئے اور ووٹنگ انفرادی طور پر ہو۔

اس موقع پر ایبے سیئز نے ایک پمفلٹ لکھا۔ جس کا عنوان تھا کہ تھرڈ اسٹیٹ کیا ہے؟ اس کا جواب تھا کچھ نہیں۔ دوسرا سوال تھا کہ وہ کیا بننا چاہتی ہے؟ اس کا جواب تھا کہ وہ کچھ بننا چاہتی ہے۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ اس موقع پر تھرڈ اسٹیٹ روایتی طور پر اپنا کردار ادا کرنے پر تیار نہیں تھی بلکہ وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔

ان کے مطالبات جو انہوں نے اسٹیٹ جنرل کے انتخابات سے پہلے پیش کئے وہ یہ تھے کہ مطلق العنان بادشاہت کا خاتمہ ہو' نیا دستور بنایا جائے' ملک کے اندر ناکہ و چنگی کو ختم کیا جائے' فرد اور پریس کی آزادی کو تسلیم کیا جائے اور معاشرہ میں مساوات کے اصول کو قائم کیا جائے۔

جب مئی 1789ء میں اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں تھرڈ اسٹیٹ کے نمائندوں کو انتہائی مایوسی ہوئی' کیونکہ اس میں قدیم روایتی رسومات کو برقرار رکھا گیا کہ جن کے ذریعہ ان کی کمتری ظاہر ہوتی تھی' مثلاً انہیں کالا لباس پہننا پڑتا تھا' اور اسمبلی کی عمارت میں عقبی دروازے سے

داخل ہونا پڑا تھا۔

اس کے بعد تینوں طبقوں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس بلائے گئے' جب اس پر تھرڈ اسٹیٹ نے احتجاج کیا تو ان پر عمارت کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس پر انہوں نے اپنا اجلاس قریبی ٹینس کورٹ میں منعقد کیا اور وہاں یہ عہد کیا کہ جب تک ان کے مطالبات نہیں مانے جائیں گے اور وہ اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے اس وقت تک نئے دستور کو نہیں بنایا جائے گا۔

23 جون کو بادشاہ نے خطاب کیا اور تھرڈ اسٹیٹ کے نمائندوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پرانا اجلاس روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے علیحدہ علیحدہ کریں۔ مگر جب وہ اپنے مطالبات پر سختی سے قائم رہے تو ان کا مطالبہ تسلیم کر کے حکم دیا کہ تینوں طبقوں کے نمائندوں کا اجلاس ایک جگہ بلایا جائے۔ مگر ساتھ ہی امراء کے اصرار پر بادشاہ نے فوج طلب کر لی تاکہ اس دباؤ سے وہ اپنا اثر قائم رکھ سکیں۔ فوج کی موجودگی سے تھرڈ اسٹیٹ کو اندازہ ہو گیا کہ بادشاہ اور امراء ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں قطعی پرخلوص نہیں۔ اس مرحلہ پر ان کی مدد کے لئے عوام آگئے جنہوں نے حالات کا رخ بدل دیا اور بادشاہ کو طاقت استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام کیوں اس مرحلہ پر اپنے نمائندوں کی مدد کے لئے آئے؟ اس کا پس منظر یہ تھا کہ عوام قیمتوں کے چڑھنے کی وجہ سے پریشان تھے۔ پیرس میں کھانے کی اشیاء بے انتہا کم ہو گئیں تھیں' خاص طور سے روٹی کی قیمت دگنی ہو گئی تھی جو عوام کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے ان حالات میں انہوں نے، احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ وہ پیرس میں شاہی محل میں جمع ہوئے جہاں کے مقررین ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعہ ان کے جذبات کو بھڑکاتے۔ خصوصیت سے ان مقررین میں ایک شخص کیمل ڈیسمولین تھا' جو امراء کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس فضا میں جب یہ افواہ پھیلی کہ بادشاہ نے فوج طلب کر لی ہے اور وہ فوج کے ذریعہ عوامی احتجاجی مظاہروں کو کچلنا چاہتا ہے' تو اس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور انہوں نے شاہی اسلحہ خانہ پر ہلہ بول دیا اور وہاں سے ہتھیار لوٹ لئے۔

14 جولائی کو عوام نے اس خیال سے کہ باسٹل کے قلعہ میں اسلحہ جمع ہے' اس پر حملہ کر دیا اور قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے گورنر کو مار ڈالا۔ باسٹل کے قلعہ پر عوام کے حملے اور اس پر قبضہ سے عوام کی قوت و طاقت کا اظہار ہوا' اور یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ عوام کے ریلے کے آگے حکومت اور اس کے ادارے زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتے۔ جب ورسائی میں بادشاہ کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے کہا "یہ تو بغاوت ہے" اس پر کسی نے جواب دیا "بغاوت

نہیں بلکہ انقلاب ہے۔"

باسٹل کی فتح اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس نے پیرس سے بادشاہ کی حکومت اور اقتدار کو ختم کر دیا' اور پیرس کے شہریوں نے ایک کمیون بنا کر شہر کے انتظام کو سنبھال لیا' نیشنل گارڈ کا قیام عمل میں آیا' فوج کی تشکیل دی گئی جس کا کمانڈر لے فایت کو مقرر کیا گیا جو امریکہ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑ چکا تھا' اس کا تین رنگوں والا جھنڈا مقرر ہوا۔ اس کے بعد سے دوسرے شہروں میں اسی قسم کی تنظیمیں قائم ہو گئیں اور انہوں نے انتظامات کو سنبھال لیا۔

ایک طرف شہروں میں یہ انقلابی تبدیلیاں آئیں تو دوسری طرف دیہاتوں میں کسانوں نے مظاہرے شروع کر دیے۔ کسانوں کا یہ ردعمل اس وجہ سے سمجھ میں آنے والا تھا کیونکہ وہی سب سے زیادہ معاشی دباؤ کا شکار تھے۔ 1788ء میں فصل کی خرابی کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے جب 1789ء میں ملک میں سیاسی بحران آیا اور یہ افواہیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ امراء فوج کے ذریعہ کسانوں پر حملے کرنے والے ہیں' تو کسانوں نے جگہ جگہ بغاوتیں شروع کر دیں' اناج کے گوداموں کو لوٹ لیا' امراء کے قلعوں اور حویلیوں پر ہلہ بول دیا اور جاگیرداروں کے تمام کاغذات اور قرضوں کی دستاویزات کو جلا دیا۔

کسانوں کی بغاوت نے اسمبلی میں متوسط طبقے کو پریشان کر دیا' کیونکہ یہ لوگ نجی جائداد کے نظریے کے حامی تھے اور جاگیرداروں پر حملے ان کے خیالات کے خلاف تھے۔ لیکن اس وقت تک ملک کا تمام نظام بکھر چکا تھا اور حکومت کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ ان بغاوتوں کو ختم کر سکے۔ اس لئے ان کے سامنے واحد راستہ یہی تھا کہ کسانوں کو رعایتیں دی جائیں اور اس طرح سے ان کے مظاہروں اور بغاوتوں کو روکا جائے۔

چنانچہ 4 اگست کو اسمبلی نے انقلابی اقدامات کا فیصلہ کرتے ہوئے کئی تجاویز منظور کیں کہ جن کے تحت جاگیرداروں کی مراعات کا خاتمہ ہوا' کسانوں کی نیم غلامانہ حیثیت' مذہبی ٹیکس' کسانوں سے بیگار لینے کے قوانین کو ختم کر دیا گیا۔ فرانس کے تمام شہر' صوبے اور جماعتیں مساوی قرار دی گئیں۔

اس طرح سے شہروں میں متوسط طبقے نے اور دیہاتوں میں کسانوں نے قدیم نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔

بادشاہ اور امراء عوامی طاقت کے اس دباؤ کے آگے جھکنے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے بادشاہ نے جاگیرداروں کی مراعات ختم کرنے کے قانون پر دستخط نہیں کئے اور اس بات کا منصوبہ بنایا کہ مزید فوج کو بلایا جائے اور طاقت کے ذریعہ ان بغاوتوں کا خاتمہ کیا جائے۔ عوام

کے جذبات اس وقت اور زیادہ بھڑک اٹھے جب ورسائی کی ایک دعوت میں امراء نے تین رنگوں والے انقلابی جھنڈے کو پاؤں تلے روند ڈالا۔

پیرس کے شاہی محل میں جہاں لوگ جمع تھے وہاں اس واقعہ پر مقررین نے زور دار تقریریں کیں اور یہ مطالبہ کیا کہ بادشاہ کو ورسائی سے پیرس لایا جائے۔ یہ موقع اس وقت ہاتھ آگیا جب روٹی کی قیمتوں کے خلاف عورتوں کا ایک جلوس ورسائی کی طرف چلا تاکہ بادشاہ اور اسمبلی سے روٹی کی قیمت میں کمی کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ ان کے ساتھ 20 میل کے سفر میں نیشنل گارڈز اور عوام کا ایک مجمع بھی شریک ہو گیا۔ انہوں نے ورسائی میں جا کر بادشاہ اور اسمبلی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ پیرس چلیں، اور پھر جب یہ جلوس واپس ہوا ہے تو اس طرح سے کہ ان کے ساتھ ایک گاڑی میں بادشاہ، ملکہ، اور ان کا لڑکا تھے جو مجمع میں گھرے ہوئے تھے۔ اس واقعہ نے جہاں عوام کی طاقت کو مستحکم کیا، وہاں متوسط طبقے کے بڑھتے ہوئے اختیارات کو بھی روکا۔ اس کے بعد سے بادشاہ اور اسمبلی پیرس میں عوام کی نظروں کے سامنے تھی، اور اب اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ عوام کے مفادات کے خلاف کوئی قانون پاس کر سکے۔

1789ء تک اسمبلی نے عوامی دباؤ کے تحت فرانسیسی اداروں اور روایات کی انقلابی تشکیل کا کام کیا۔ اس عمل میں اکثریت ان اراکین کی تھی جن کا تعلق متوسط طبقے سے تھا مگر ان کے ساتھ کچھ روشن خیال امراء اور چرچ کے نمائندے بھی تھے۔ انہوں نے جو اصلاحات کیں ان کا تعلق انقلاب فرانس کے اہم دور سے تھا۔

اس سلسلہ میں اہم بنیادی اصلاح "حقوق انسانی" کے نام سے وہ اعلان ہے جو اسمبلی نے جاری کیا۔ اس کے تحت اقتدار اعلیٰ بادشاہ سے لے کر عوام کے سپرد کر دیا گیا، اور انہیں یہ حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو دستور بدل دیں، اور حکومت کے عہدے داروں کا احتساب کریں۔ اس کے اہم اصولوں میں آزادی اور مساوات کے اصول تھے کہ لوگوں کی اہمیت ان کے کام سے ہونی چاہئے اس سے نہیں کہ وہ خاندانی طور پر کیا ہیں۔ اس لئے عہدوں پر تقرر ذہانت کی بنیادوں پر ہو گا، خاندانی تعلق اور رشتے سے نہیں۔ اس میں آزادی تحریر و تقریر، اور پریس کی آزادی کا حق دیا گیا، اور اس اصول کو قائم کیا گیا کہ کسی بھی شخص کو بلا قانونی جواز کے گرفتار نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ ہر آدمی اس وقت تک بے قصور ہے جب تک کہ اس پر جرم ثابت نہ ہو۔

چونکہ اسمبلی میں متوسط طبقہ کی اکثریت تھی اس لئے انہوں نے بڑی خوبصورتی سے ان

اصلاحات کے ذریعہ اپنے اقتدار کو باقی رکھا اور اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ انہوں نے ایسی اصلاحات سے گریز کیا کہ جس سے معاشی ناہمواری دور ہوتی، خاص طور سے انہوں نے نجی ملکیت کے حق کو برقرار رکھا۔ انتخاب میں حق رائے دہی سب کو نہیں دیا، بلکہ یہ حق ان کے لئے مخصوص رکھا جو ٹیکس ادا کرتے تھے اور جائیداد کے مالک تھے، تاکہ صرف متوسط طبقے کے لوگ ووٹر بن سکیں۔

لیکن یہ اصلاحات فرانس میں اس لئے انقلابی ثابت ہوئیں کہ انہوں نے قدیم نظام کو الٹ کر رکھ دیا، مثلاً جاگیرداروں کے تمام قرضے ختم کر دیئے، جہاں جہاں صرف نیم غلام کسان تھے انہیں آزاد کر دیا، چرچ کا ٹیکس ختم کر دیا گیا، امراء کے موروثی خطاب کو ختم کر کے تمام شہریوں کا درجہ برابر کر دیا۔ ملک کے انتظامی ڈھانچے میں جو پیچیدگیاں تھیں انہیں دور کیا گیا اور اس مقصد کے لئے 83 ڈیپارٹمنٹس تشکیل دے کر انہیں 374 کنٹونز اور 44000 کمیون میں تقسیم کیا تاکہ انتظامات میں آسانی ہو۔ تمام عہدے داروں کا انتخاب ووٹنگ کے ذریعہ ہونے لگا۔

اسی طرح عدالتی نظام میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں، اور قدیم نظام میں جو مختلف قسم کی عدالتیں تھیں انہیں ختم کر دیا گیا، اور ان سب کی جگہ ایک عدالت مقرر ہوئی جو لوکل گورنمنٹ کے ماتحت ہوتی تھی۔ ججوں کا تقرر انتخاب کے ذریعہ ہونے لگا۔ مقدمہ کی کارروائی کھلی ہوتی تھی اور مقدمہ کے فیصلہ کے لئے جیوری کا طریقہ رائج کیا گیا۔ جیل میں اذیت و تشدد کے طریقوں کا خاتمہ ہوا۔ موت کی سزا برقرار رکھی مگر اس میں بھی مساوات کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ قدیم نظام میں امراء کا سر اڑا دیا جاتا تھا جب کہ عام آدمی کو پھانسی دی جاتی تھی، اب سب کو ایک ہی طریقہ سے سزا دی جانے لگی یعنی گلوٹن کے ذریعہ سر اڑا کر۔

معاشی اصلاحات میں ناپ و تول کے مساوی پیمانوں کا رواج ہوا۔ ملک کے چنگی اور اندرون ملک کسٹم ڈیوٹیاں ختم کر دی گئیں، اور اس طرح تجارت میں جو رکاوٹیں تھیں انہیں دور کر دیا گیا۔ ٹریڈ یونین پر پابندی لگا دی گئی۔

اس کے بعد اسمبلی نے چرچ کی اصلاحات کی طرف توجہ دی۔ اس کا آغاز اس طرح سے ہوا کہ جب اسمبلی نے پرانے ٹیکس ختم کر کے نئے لگائے تو وہ ان کی وصولیابی نہیں کر سکی جس کی وجہ سے حکومت اقتصادی بحران کا شکار ہو گئی۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ چرچ کی جائداد ضبط کر کے اس آمدنی سے حکومت کے مالی وسائل کو حل کیا جائے۔ چونکہ چرچ کی جائداد نجی جائداد کے زمرے میں نہیں تھی اس لئے اس فیصلہ پر بورژوا طبقے کے اراکین تیار ہو گئے، اس کے علاوہ اس جائداد کو خریدنے والے بھی اکثر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ایک بار

جائداد خرید کر انہیں جو معاشی فوائد ہوئے اس کے بعد انہوں نے کوشش کی کہ اب کوئی معاشی اصلاحات نہ ہوں تاکہ انہوں نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے وہ اس سے محروم نہ ہوں۔

اسمبلی بھی ملکیت کے تقدس کی قائل تھی۔ اس لئے انقلاب کے دوران جو بھی جائدادیں ضبط ہوئی تھیں ان کو حکومت کی جانب سے معاوضہ دیا گیا' ان میں چرچ کی زمینیں بھی شامل تھیں۔ چرچ کو جائداد سے محروم کرنے کے بعد انہوں نے اس بات کی طرف توجہ دی کہ چرچ کے ڈھانچے کی ازسرِنو تشکیل کی جائے۔ اس سلسلہ میں 1790ء میں چرچ کا ایک نیا دستور بنایا گیا' جس کے تحت چرچ کے علاقوں کو نئے سرے سے تقسیم کیا گیا' چرچ کے عہدے داروں کے لئے بھی انتخاب کے ذریعہ کامیاب ہونا قرار پایا اور یہ طے پایا کہ چرچ کے تمام عہدے دار اس نئے دستور پر حلف لیں جو اسمبلی نے ان کے لئے بنایا ہے۔ پوپ نے ان اصلاحات اور چرچ کے دستور کی سخت مخالفت کی' اس لئے چرچ کے لوگ دو جماعتوں میں بٹ گئے: پوپ کے وفادار' اور دستور کے وفادار۔

اسمبلی نے 1791ء میں ملک کا نیا دستور بنایا جس کے تحت انہوں نے بادشاہت کے ادارے کو تو قائم رکھا مگر اس کے اختیارات کم کر کے اسے دستور کے ماتحت کر دیا۔ بادشاہ منتظمہ کا سربراہ تو رہا مگر اس کے اختیارات محدود ہو گئے۔ وہ اپنے وزراء کو منتخب تو کر سکتا تھا' مگر وہ نہ تو اسمبلی میں بیٹھ سکتے تھے اور نہ اس کے رکن بن سکتے تھے۔ بادشاہ کسی نئے قانون کو اسمبلی میں روشناس نہیں کرا سکتا تھا۔ اس کے پاس نہ تو ویٹو کا اختیار تھا اور نہ ہی وہ اسمبلی توڑ سکتا تھا' اسمبلی عوام کی نمائندہ تھی اور ان کے اقتدارِ اعلیٰ کی علامت۔

دستور کے مکمل ہونے سے قبل ہی کچھ واقعات نے حالات کا رخ موڑ دیا' کیونکہ اس دوران میں بادشاہ نے 1791ء میں پیرس سے فرار ہونے کی کوشش کی تاکہ شمالی مشرقی سرحدوں پر جا کر وہاں اپنی وفادار فوجوں اور آسٹریا کی مدد سے اپنے تخت و کھوئے اقتدار کو واپس حاصل کرے مگر فرار کے دوران اسے پہچان لیا گیا اور اسے واپس پیرس لایا گیا۔ اس واقعہ نے عوام پر یہ ثابت کر دیا کہ بادشاہ ان کے ساتھ وفادار نہیں' اور وہ انقلاب کے عمل اور اس کے نتائج کو ختم کرنا چاہتا ہے اس لئے اب یہ مطالبات شروع ہو گئے کہ بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔

یہ مطالبات پیرس میں ان سیاسی کلبوں کی جانب سے شروع ہوئے جو انقلاب کے دوران قائم ہوئے تھے۔ ان میں خصوصیت سے دو کلب بہت اہم تھے کورڈی لیر اور جیکوبن۔ ان کی جانب سے ایک مظاہرہ بادشاہ کے خلاف شان دمار کے چوک پر ہوا جسے فوج نے سختی سے کچل

دیا اور 50 کے قریب لوگ اس میں مارے گئے اس واقعہ نے بورژوا اور عوام دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔

اس کے بعد اسمبلی نے جلدی جلدی دستور منظور کر کے خود کو توڑ دیا اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اسمبلی کے اراکین کا خیال تھا کہ انقلاب مکمل ہو گیا ہے اور قدیم نظام کی وہ اہم خرابیاں بادشاہ کی مطلق العنانیت اور امراء کی قانونی مراعات ختم کر دی گئی ہیں' لہٰذا اب فرانس کو نئے دستور کے مطابق چلنا چاہئے۔

اکتوبر 1791ء میں جو انتخابات ہوئے ان میں اسمبلی کے پرانے اراکین نے دستور کے مطابق حصہ نہیں لیا۔ اس میں چننے والوں کی اکثریت کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ یہ اسمبلی میں دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور اپنی نشستوں کے اعتبار سے دائیں و بائیں بازو والے کہلائے۔ دائیں بازو والے دستوری بادشاہت کے حامی تھے جبکہ بائیں بازو والے جمہوریت کے۔ بائیں بازو کا راہنما بری سو تھا' اور اس کے حامی گروں ڈسٹ کہلاتے تھے۔ یہ انقلاب دشمن عناصر کے خلاف سخت اقدامات کا حامی تھا۔

اس دوران میں انقلاب کو ایک خطرہ اور درپیش تھا۔ جو امراء انقلاب کے دوران بھاگ کر یورپ کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے' وہ آسٹریا اور پروشیا کی فوجوں کے ہمراہ فرانس پر حملے کی خاطر تیار بیٹھے تھے۔ بری سو نے اس موقع پر جنگ پر زور دیا تاکہ بادشاہ اور امراء کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کیا جائے' اور اس سے فائدہ اٹھا کر اندرونی دشمنوں کا بھی صفایا کیا جا سکے' کیونکہ یہی ایک طریقہ تھا کہ جس کی ذریعہ وہ انقلاب کو اندرونی طور پر مستحکم کر سکتے تھے۔

اپریل 1792ء میں فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا' مگر جنگ میں فرانس کی فوجوں کو ناکامی ہوئی۔ اس بحران نے فرانس کی معاشی حالت کو بگاڑ دیا' اور اس کی کرنسی کی قیمت گھٹتے گھٹتے بہت کم ہو گئی۔ عوام نے اس کی تمام ذمہ داری بادشاہ اور اس کے درباریوں پر ڈال دی۔

ان حالات میں راہبیں پیئر نے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک قومی کنونشن کا مطالبہ کیا کہ جس میں ایک نیا دستور بنایا جائے۔ اسے جیکوبن کلب کے اراکین کی حمایت حاصل تھی۔ پیرس کے عوام اس وقت تک اندرونی خلفشار اور بیرونی دشمنوں کے حملوں کی خواہش کے نتیجہ میں بادشاہ سے بیزار ہو چکے تھے' اور یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ بادشاہ کو معزول کر دیا جائے۔ اپنے مطالبہ کی حمایت میں ایک دن انہوں نے شاہی محل پر حملہ بول دیا۔ بادشاہ اور ملکہ نے بھاگ کر اسمبلی کی عمارت میں پناہ لی مگر عوام کا دباؤ اس قدر تھا کہ اسمبلی نے ان کا مطالبہ

مانتے ہوئے بادشاہ کو معزول کر دیا۔ ایک عبوری کونسل "کومیتوں" کی سربراہی میں بنی تاکہ کونشن کے انتخابات ہوں اور نیا دستور بنایا جائے۔

کونشن میں جن سیاسی کلبوں کے اراکین منتخب ہو کر آئے ان میں گرون دست کلب تھا' جس کے اراکین صوبائی عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور جیکوبن کلب پیرس کے عوام کا نمائندہ تھا۔ مگر ان دونوں کلبوں کے اراکین کا تعلق متوسط طبقے سے تھا اس لئے یہ بھی جائداد کے تقدس' آزاد تجارت' جمہوری اقدار کے فروغ' بادشاہت کے خاتمہ' جنگ کو جاری رکھنے' اور انقلاب کے نتائج کو محفوظ رکھنے کے حامی تھے۔

انقلاب کے اس عمل میں پیرس کے عوام ایک مضبوط طاقت کے طور پر ابھر چکے تھے۔ ان میں نچلے طبقوں کے لوگ' چھوٹے دوکاندار' دستکار اور مزدور پیشہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ معاشی طور پر بدحال تھے' اور ان کے مطالبات میں سے اہم یہ تھے کہ روز مرہ کی چیزوں کی قیمتوں کا تعین کیا جائے اور ذخیرہ اندوزوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ یہ صحیح طور پر انقلابی تھے' اور معاشرے سے طبقاتی اونچ نیچ کو مٹا دینا چاہتے تھے' اس لئے انہوں نے طرز تخاطب میں تبدیلی کی' اور محترم یا موسیو کی جگہ ہر ایک کو شہری کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ لباس میں بھی تبدیلی آئی اور اونچے طبقوں کے فیشن ختم کر دیئے گئے۔ جیکوبن کلب کو انہیں لوگوں کی حمایت حاصل تھی' اور انہیں لوگوں کے مطالبے پر فرانس کے بادشاہ کو 21 جنوری 1793ء میں سزائے موت دے دی گئی۔

اس طبقہ کی قدیم نظام اور اس کی روایات سے نفرت و دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ صدیوں سے امراء جاگیردار طبقوں نے انہیں ذلیل و خوار رکھ کر انہیں زندگی کی ہر نعمت سے محروم رکھا تھا' اس لئے جب ایک مرتبہ انہیں اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوا تو انہوں نے ہر اس چیز اور علامت کو مٹانا چاہا جس سے ان کی سماجی کمتری ظاہر ہوتی تھی۔ بادشاہت کا ادارہ چونکہ قدیم نظام کا سب سے بڑا ستون تھا' اس لئے اسے گرا کر انہوں نے اپنی صدیوں کی محرومی کا انتقام لیا۔

فرانس کو میدان جنگ میں بھی کامیابی ہوئی اور فرانسیسی فوجوں نے آگے بڑھ کر فرینکفرٹ اور مینز پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کونشن نے یہ اعلانات کئے کہ:

1- یورپ میں فرانس قدیم حکومت کے خلاف عوام کی مدد کرے گا۔ اس لئے انہوں نے یورپ کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

2- یورپ کے جن علاقوں پر فرانس نے قبضہ کر لیا تھا' وہاں پر انہوں نے چرچ کے تمام ٹیکس

اور جاگیردارانہ ٹیکسوں کا خاتمہ کر دیا۔

3- یہ فیصلہ کیا کہ حکومت کے تمام عہدے انتخاب کے ذریعہ پر کئے جائیں گے۔

4- بادشاہ کی تمام جائداد پر حکومت کا قبضہ ہو گا۔

جنگ میں ابتدائی کامیابیوں کے بعد فرانس کو ہمسایہ ملکوں سے جنگ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ناکامی کی ایک وجہ فوجی جنرلوں کی غداری تھی۔ جب یہ خبریں پیرس کے عوام تک پہنچیں کہ فرانس کے بھگوڑے امراء جوابی کاروائی کے لئے تیاری کر رہے ہیں تو اس نے انہیں پریشان کر دیا۔ اب اندرونی و بیرونی خطرات و بحرانوں سے نمٹنے کے لئے کونشن نے دو ادارے قائم کئے' ان میں سے ایک کمیٹی آف سیفٹی اور دوسرا انقلابی ٹربیونل تھا۔ تاکہ ان کے ذریعہ بدعنوانیوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس عرصہ میں 31 مئی سے 2 جون تک پیرس میں انقلابی صورتحال رہی۔ 2 جون کو پیرس کے عوام نے اسمبلی کی عمارت کو گھیرے میں لے لیا اور کہا کہ وہ غداری اور مجرموں کی سزا کا مطالبہ کرنے آئے ہیں۔ اس صورت حال سے جیکوبن اراکین نے فائدہ اٹھایا اور ایک قرارداد کے ذریعہ 10 کے قریب گرون دست اراکین کو اسمبلی سے نکلوا دیا۔ اس کے بعد سے کونشن میں ان کی حیثیت مضبوط ہو گئی۔

اس عرصہ میں فرانس کی اندرونی و بیرونی صورت حال خراب ہو چکی تھی۔ آسٹریا' پروشیا اور انگلستان کی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی تھیں' صوبوں میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا' جیکوبن کے راہنما میراٹ کے قتل نے صورتحال کو اور بگاڑ دیا لیکن ان تمام ہنگاموں کے باوجود جیکوبن اراکین نے ایک نیا دستور پیش کیا' جس کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

1- بالغ حق رائے دہی

2- براہ راست انتخابات

3- حکومت کی ذمہ داری کہ وہ ہر صحت مند شخص کو ملازمت فراہم کرے اور ضرورت مندوں کی مالی امداد کرے۔

4- تمام شہریوں کے لئے مفت تعلیم کا بندوبست

لیکن محض ان اصلاحات نے حالات کو سدھارنے میں کوئی مدد نہیں کی۔ محاذ پر شکست' فوجوں کی غداری' ملک میں مہنگائی' اور کھانے کی اشیاء کی نایابی نے عوام کی بے چینی کو بڑھا دیا۔ اس لئے اسمبلی پر عوام کا دباؤ بڑھتا رہا کہ اس مہنگائی پر قابو پایا جائے۔ امراء اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کی جائے اور بدعنوان عہدے داروں کو سخت سزا دی جائے۔

جولائی 1793ء سے جولائی 1794ء تک انقلاب اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں

رابس پیر کا عروج ہوا' جس نے جیکوبن کلب اور پیرس کے عوام کی مدد سے تشدد کی پالیسی پر عمل کیا۔ رابس پیر روسو کے خیالات سے متاثر تھا' وہ انقلاب کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتا تھا کہ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کیا جائے' اور بدعنوانوں کو سختی و تشدد سے ختم کیا جائے۔ اس نے کمیٹی آف پبلک سیفٹی اور انقلابی ٹریبونل کے ذریعہ حکومت و انقلاب دشمن عناصر کے خلاف اقدامات کئے۔ اس کے دور اقتدار میں (40 ہزار) افراد کو قتل کیا گیا' اور اس سے زیادہ لوگوں کو قید خانہ میں ڈالا گیا۔ ان لوگوں میں جو ان سزاؤں کا شکار ہوئے 17 فیصد امراء تھے' 6 فیصد چرچ کے لوگ تھے 15 فیصد کا تعلق متوسط طبقے سے تھا' اور اکثریت غریب عوام کی تھی۔ سزائیں سیاسی جرائم پر دی گئیں۔ دیہاتوں اور صوبوں میں بغاوتوں کا خاتمہ کیا گیا اور فائرنگ اسکواڈ کے ذریعہ ہزاروں لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بغاوت کے جرم میں شہروں کو جلا دیا گیا' امراء کے مکانات مسمار کئے گئے۔ انصاف کی غرض سے جگہ جگہ انقلابی عدالتیں قائم کی گئیں۔ انقلاب دشمن لوگوں کی جائدادیں ضبط کی گئیں' اجارہ داری' ذخیرہ اندوزی' اور قیمتوں کے مصنوعی اتار چڑھاؤ کو ختم کر دیا گیا۔

بیرونی حملہ آوروں سے نمٹنے کے لئے لازمی فوجی ملازمت کے ساتھ پروپیگنڈے کو بھرپور طور پر استعمال کیا گیا۔ 1794ء میں دس لاکھ فوجی تیار کئے گئے اور اس کے ساتھ ہی اسلحہ کا انتظام کیا گیا۔ اسلحہ کے نئے کارخانے قائم ہوئے' نئے جنرلوں کا تقرر ہوا اور فوجیوں میں انقلاب کے لئے جوش و جذبہ پیدا کیا' جس کی وجہ سے انہوں نے بیرونی حملوں کو روک دیا۔

معاشرے سے مذہبی عقائد کو ختم کرنے کی غرض سے عیسائی کیلنڈر کے بجائے ایک نئے کیلنڈر کا اجراء ہوا' جس میں مہینوں کے نام فطرت سے منسوب تھے' ہفتہ دس دن کا تھا' مذہبی بزرگوں کے دن جو منائے جاتے تھے' وہ ختم ہوئے' تمام مذہبی چھٹیاں ختم کر دی گئیں۔ نومبر 1793ء میں پیرس کے مشہور چرچ نوٹرڈیم میں عقل پرستی کا جشن منایا گیا۔

مگر اس عرصہ میں رابس پیر کی مخالفت شروع ہو گئی اور 28 جولائی 1794ء کو اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد حکومت جن لوگوں کے پاس آئی وہ معتدل خیالات کے لوگ تھے۔ ان میں گروں ڈسٹ کلب کے اراکین اور وہ قدیم امراء تھے جو جمہوریت کے حامی تھے۔ انہوں نے تشدد کی پالیسی کو ختم کر کے انقلاب کو 1789ء کی حالت میں واپس لانا چاہا۔ جیکوبن کلب کو بند کر کے اس کے اراکین کو گرفتار کر لیا' اور 1795ء تک پیرس کے عوام کو سختی سے کچل دیا۔ اس کے بعد انقلاب جائداد رکھنے والوں کے لئے محفوظ ہو گیا۔

1795ء میں ایک نیا دستور بنا' اس میں اہل جائداد کے مفادات کا خیال رکھا گیا اور ایسے اقدامات کئے کہ عوام کی طاقت دوبارہ سے نہیں ابھر سکے۔ اسمبلی طاقت ور نہ ہو' اور نہ ہی کسی کمیٹی یا فرد کو تمام اختیارات مل سکیں۔ یہ دور ڈائرکٹری کا کہلاتا ہے۔ فرانس کی صورت حال جب منتخب اداروں سے نہیں سنبھل سکی تو ان حالات میں نپولین نے فائدہ اٹھایا اور فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے پہلے اپنی آمریت قائم کی' اور بعد میں بادشاہ بن بیٹھا۔

فرانسیسی انقلاب کے دنیا کی تاریخ پر گہرے اثرات ہوئے۔ اسی لئے فرانسیسی مورخوں نے اس انقلاب کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ اس کی وجہ سے ان کے ملک کو یورپ کے دوسرے ملکوں پر فوقیت ہوئی۔

فرانسیسی انقلاب کا ایک اہم عنصر تشدد پسندی کا تھا۔ یہ عنصر بعد میں بھی ہر انقلاب کی خصوصیت رہا۔ ڈر اور دہشت کا زمانہ ہر انقلاب میں طویل ہوتا ہے' اسی لئے اکتوبر 1793ء میں کونشن نے یہ اہم اعلان کیا کہ "فرانس کی حکومت انقلابی ہے اور یہ اس وقت تک رہے گی جب تک کہ امن قائم نہیں ہو جاتا" اس کا مطلب تھا کہ انقلاب کے نام پر حکومت ہر قدم اٹھا سکتی تھی۔ کارلائل نے فرانسیسی انقلاب میں تشدد کو جائز بتایا ہے کیونکہ یہ بدعنوانیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا۔

فرانسیسی انقلاب نے قدیم نظام کو جو کہ فرسودہ اور خستہ ہو چکا تھا اور جس کی بنیاد میں سماجی ناہمواری' اور طبقاتی تقسیم گہرائی کے ساتھ موجود تھی' اس نظام کی ایک ایک اینٹ کو اکھاڑ پھینکا اور سیاسی و سماجی و معاشی اور مذہبی ادارے و روایات کی نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ مراعات و امتیاز کی وجہ سے فرانسیسی قوم ٹکڑوں' طبقوں میں بٹی ہوئی تھی' اس کا خاتمہ کر کے ایک متحد فرانسیسی قومیت کی تشکیل کی' چنانچہ انقلاب کے نتیجہ میں طبقاتی زبان ختم ہو کر ایک قومی زبان بنی۔ ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کے لئے مفت تعلیم کا انتظام ہوا' قومی اتحاد کے لئے قومی جھنڈا' ترانہ' قومی فوج' اور قومی چھٹیوں کا رواج ہوا' اور جب حکومت میں عوام کو اقتدار اعلیٰ ملا تو انہوں نے انتخابات اور حق خود ارادی کے ذریعہ قومیت کے عناصر کی تشکیل دی۔

بادشاہت کے خاتمہ سے جمہوری اداروں کو مضبوط کیا' اور فرد کو ایک اعلان نامہ کے تحت آزادی کی ضمانت دی گئی جس کا تحفظ دستور اور قانون کے ذریعہ کیا گیا۔ قانون کے ذریعہ مساوات کے اصول قائم کر کے تمام فرانسیسی قوم کو ایک کر دیا۔

فرانسیسی انقلاب نے جہاں دنیا بھر کے مظلوم عوام کو جدوجہد کا پیغام دیا اور انہیں استحصال

نظام کے خاتمہ کی امید دلائی' وہاں دنیا بھر کے رجعت پرست اور مراعات یافتہ طبقوں کو اس سے تشویش ہوئی کہ اس انقلاب کو کیسے روکا جائے۔ ان کی نمائندگی برطانیہ میں برک نے کی۔ اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ حکومت کرنے کا حق صرف امراء کو ہے کیونکہ ان کے پاس تعلیم' جائداد اور سیاست ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا حکومت و اقتدار پر قابض ہونا ایک فطری امر ہے' جبکہ نچلے طبقے کے لوگ جو جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں وہ صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں اور حکومت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ جمہوریت اور جائداد کی تبدیلی اور اس کی تقسیم آزادی کے لئے ایک خطرہ ہے اس لئے قائم شدہ اداروں کو مثلاً چرچ وغیرہ کو قائم رہنا چاہئے' تاکہ یہ معاشرہ کو انتشار سے بچا سکیں۔ ایک مستحکم معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں آہستہ آہستہ اصلاحات کی جائیں۔

مراعات یافتہ طبقے جو قدیم نظام کے حامی تھے' وہ انقلاب کی تباہ کاریوں سے خوف زدہ تھے' وہ لوگوں میں اس دہشت کو پھیلا رہے تھے کہ اس سے یورپ کی تہذیب ختم ہو جائے گی۔ رجعت پرست سیاستدان اپنے اپنے ملکوں میں انقلاب کو روکنے کے لئے خصوصی منصوبے بنا رہے تھے۔ اس کے رد عمل میں انہوں نے عوام اور مزدوروں کی ہر تحریک کو سختی کے ساتھ کچل دیا۔ جیسے انگلستان میں 1819ء میں پیٹرلو کا قتل عام' یا لندن میں مزدوروں کی بغاوت کا خاتمہ (1832ء) یورپ میں 1848ء میں جو انقلاب کی لہریں آئیں' انہیں بھی سختی کے ساتھ کچل دیا گیا' لیکن جہاں یہ انقلابی کوششیں ناکام ہو گئیں' وہیں پر انہوں نے عوامی طاقت کو ابھارا بھی۔ یورپ میں ٹریڈ یونین کی ابتداء' اور سوشل ازم کے نظریات کی مقبولیت اسی دوران میں ہوئی کیونکہ فرانسیسی انقلاب کے بعد ان کے سامنے یہ نتائج آئے کہ جب تک نجی جائداد کا تحفظ برقرار رہے گا' اس وقت تک صحیح معنوں میں اقتدار عوام کو منتقل نہیں ہو گا' اور یہ تبدیلی حکمران طبقوں کی تبدیلی ہو گی' مگر عوام اسی طرح سے پابندیوں کا شکار رہیں گے اس لئے ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جو نجی جائداد کے ادارے کو ختم کر کے اقتدار کو مکمل طور پر عوام کے ہاتھوں میں منتقل کر دے۔

اس کے لئے انہیں 1917ء تک انتظار کرنا پڑا۔

روسی انقلاب

فرانسیسی انقلاب کے بعد روسی انقلاب نے دنیا کی تاریخ پر گہرے اور دیرپا اثرات ڈالے۔ یہ انقلاب بھی صرف روس تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے دنیا کے تمام ملکوں کو متاثر کیا۔ اس انقلاب کی جڑیں روسی معاشرے کے طبقاتی نظام میں پیوست ہو گئیں اور اندرونی و بیرونی تضادات و واقعات نے انقلاب کو پھیلایا اور قدیم نظام کو توڑنے میں مدد دی۔

زار کا روس ایک وسیع و عریض ملک تھا کہ جس میں ایشیا و یورپ کی اقوام اور مختلف نسلوں کے لوگ رہتے تھے' اور بادشاہ کی مرکزی شخصیت کے گرد مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگ متحد تھے۔ بادشاہ روس کے عوام کا سرپرست اور محافظ تھا' جس کے خلاف بغاوت کرنا یا سازش کرنا ایک بڑا جرم تھا۔ وسیع اختیارات نے زار کو ایک مطلق العنان بادشاہ بنا دیا تھا کہ جس پر تنقید کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کسی عوامی نمائندہ ادارے کی اس نظام میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بادشاہ وزراء کو اپنی پسند سے منتخب کرتا تھا۔ اور جب چاہتا تھا انہیں برطرف کرتا تھا۔ زار کی شخصیت میں مقننہ' انتظامیہ' اور عدلیہ تینوں ادارے جمع ہو گئے تھے۔ ان وسیع اختیارات کے سبب ایک شخص کے لئے یہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ملک کے وسیع اختیارات کو سنبھال سکے' اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہو' اور بے پناہ توانائی رکھتا ہو تاکہ وہ ملک کے تمام امور پر نظر رکھ سکے۔

مطلق العنان حکومت کا قیام پولیس' مخبری کے اداروں' اور تشدد پر ہوتا تھا تاکہ مخالفین کو بالکل ابھرنے کا موقع نہیں دیا جائے اور بادشاہ کے خلاف ہر تحریک کو سختی سے کچل دیا جائے۔ ان اداروں کا پھیلاؤ حکومت و بادشاہ کی کمزوری کے ساتھ زیادہ ہوتا چلا گیا اور اس طرح ملک کی آمدنی کا بڑا خرچہ ان اداروں پر ہونے لگا۔ حکومت کے ادارے عوام کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی بہبود کے بارے میں کام کرنے کے بجائے انہیں خاموش کرنے پر زیادہ توجہ دینے لگے۔

نکولس دوم جو 1896ء میں روس کا زار بنا' اس میں سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ کی کمی تھی اس پر ملکہ الیگزینڈرا کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا' جو ملک کے معاملات میں دخل دے کر

پی پسند کے وزراء کو اقتدار میں لاتی اور انہیں برطرف کراتی۔ یہ وزراء چونکہ زار کے تحت ہوتے تھے۔ اس لئے یہ خوشامد و چاپلوسی کے ذریعہ زار کو خوش رکھ کر اپنے اقتدار کو برقرار رکھتے تھے۔

زار عوام سے دور محلات میں رہتا تھا اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر تھا اس لئے ملکی معاملات کے فیصلوں میں اس کے ارادوں کی ناپختگی، اور سیاسی حالات سے بے خبری ظاہر ہوتی تھی۔ دربار کی سازشوں اور امراء کی باہمی رقابتوں کے سبب اس کے لئے مشکل تھا کہ وہ ان کا بھرپور تعاون حاصل کر سکے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ ملک کے اعلیٰ عہدوں پر انہیں فائز کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مراعات انہیں دی جائیں۔

سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ زار معاشی وسائل کے ساتھ روس کے امیر ترین لوگوں میں سے تھا اس کی زمینیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ کسان اسی کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔

ملک کی صنعت و حرفت میں بھی اس نے سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے بادشاہ اور حکومت ایک انتہائی طاقت ور ادارے کی حیثیت سے مستحکم تھے کہ جس میں انفرادی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

بادشاہ کے بعد ریاست کے سب سے زیادہ طاقت ور ادارے فوج اور نوکر شاہی تھے۔ جن کی مدد سے بادشاہ، امراء و جاگیردار دوسرے طبقوں کو دبا کر رکھتے تھے۔ نوکر شاہی اور فوج میں صرف امراء کے طبقے سے باصلاحیت اور ذہین افراد کو لیا جاتا تھا اور انہیں اپنے عہدے کے اعتبار سے وسیع اختیارات ملے ہوئے تھے۔ ان کی وفاداری چونکہ زار سے ہوتی تھی اس لئے وہ اس کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ ان کا تعلق عوام سے بالکل نہیں ہوتا تھا، اور یہ خود کو عوام کا حکمران سمجھ کر انہیں ذلت و حقارت سے دیکھتے تھے۔ اعلیٰ عہدوں پر ان کی اجارہ داری کی وجہ سے دوسرے طبقوں کے باصلاحیت افراد کے لئے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے تمام راستے بند تھے۔

بادشاہت کے ادارے کا سب سے مضبوط ستون امراء تھے، جن کی بڑی بڑی جاگیریں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ اپنی مراعات کے آہنی دائرے میں اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ یہ ملک میں کسی قسم کی اصلاحات نہیں چاہتے تھے، اور اپنی مراعات سے دستبردار ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ خصوصیت سے معاشی اصلاحات کے سخت مخالفین میں تھے کیونکہ اس سے ان کی مالی حالت پر اثر پڑتا تھا۔ 1900ء میں یہ طبقہ اپنے جمود اور گھٹن کی وجہ سے زوال

پذیر ہو رہا تھا اور اس میں باصلاحیت افراد کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔

روس کا آرتھوڈوکس چرچ بھی مکمل طور پر حکومت کے ساتھ تھا، اور اس کا کام عقائد، دعاؤں اور روایات کا تحفظ تھا، اس لئے یہ لوگوں سے کٹ گیا تھا، اور ان کے جذبات و خواہشات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

اس کے مقابلہ میں آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی جو خاندانوں کی شکل میں گاؤں میں نچلی زندگی گزارتے تھے۔ یہ معاشرہ میں سماجی لحاظ سے انتہائی پست اور نچلے درجہ پر تھے، 1897ء میں چیخوف نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ "یہ لوگ گاؤں میں مویشیوں کی طرح رہتے تھے، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا دوبھر تھا، کیونکہ یہ جاہل، غلیظ، گندے، بے ایمان، اور نشہ باز تھے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ پرامن نہیں رہ سکتے تھے، بلکہ جھگڑالو تھے۔ وہ ڈرتے تھے، ہر ایک پر شبہ کرتے تھے اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔" پھر وہ سوال کرتا ہے کہ "آخر ان کی یہ حالت کیوں ہوئی؟" اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "محنت کی بیگاری، سخت سردی، خراب فصلیں، کھانے کی کمی، اور کسی مدد کی توقع نہ ہونا، یہ وہ وجوہات تھیں جنہوں نے ان کے کردار کی تشکیل کی۔" ان پر ٹیکسوں کی بہتات تھی، اگر وہ ٹیکس نہیں دے سکتے تھے تو قید و بند، کوڑوں سے پٹائی کرنا، اور تشدد کے ساتھ جسمانی طور پر اذیت پہنچانا عام روایات تھیں۔ ان میں سے اکثر کسان زندگی بھر اپنے گاؤں سے نہیں نکل سکتے تھے اور پوری زندگی ایک ہی جگہ گزار دیتے تھے۔ غربت و افلاس اور جہالت نے انہیں مایوس، سخت مذہبی، اور توہم پرست بنا دیا تھا، اور ان میں اپنی زندگی کو بدلنے کا بالکل شعور و احساس نہیں تھا۔

تیسرا گروہ تعلیم یافتہ لوگوں کا تھا جن میں تاجر، وکیل، استاد، اور متوسط طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے سبب قدیم نظام اور اس کی خرابیوں سے بیزار تھے۔ چونکہ اس طبقہ کی راہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں تھیں، اس لئے ان کا مطالبہ تھا کہ روس میں مغربی طرز کے سیاسی ادارے ہوں تاکہ ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کر کے آگے بڑھ سکیں۔

اس طرح روس کا معاشرہ دو بڑے طبقوں میں بٹا ہوا تھا، مراعات یافتہ، اور محروم لوگ۔ مراعات یافتہ طبقہ میں امراء، زمیندار و جاگیردار، نوکر شاہی، فوج کے بڑے عہدیدار، پادری، اور بڑے تاجر شامل تھے۔ یہ لوگ مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر تھے اس لئے ان کا طرز معاشرت اور رہن سہن مغربی تھا۔ ان کی تعلیم یورپ کے تعلیمی اداروں میں ہوتی تھی اور یہ لوگ آپس میں فرانسیسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ جرمن اور انگریزی زبانوں کا جاننا مہذب ہونے کی علامت

تھی۔ روسی زبان میں یہ لوگ اپنے ماتحتوں اور ملازموں سے بات کیا کرتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت دعوتوں، رقص و سرود کی محفلوں، اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ اکثر امراء اپنی جاگیر پر حویلیوں میں رہتے تھے اور اپنا زیادہ وقت سیر و شکار میں گزارتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں ان کے محلات تھے جہاں یہ آتے جاتے رہتے تھے۔ تعلیمی و تہذیبی لحاظ سے یہ خود کو عوام سے برتر سمجھتے تھے۔ اس لئے مراعات یافتہ طبقوں کی دنیا اور تھی جہاں زندگی بڑی سہل اور سبک رفتاری کے ساتھ آہستہ آہستہ خوشگوار طریقہ سے بسر ہوتی تھی، جہاں موسیقی کی دھنیں، رقص کی انگڑائیاں اور مصوری کے شوخ رنگ تھے، جہاں فیشن کے نت نئے انداز، زیورات و جواہرات اور ملبوسات کی رنگینی آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھی، اور پھر جہاں عورتیں، لذت کی جنت، اور رومانس تھے۔

خود زار کے محلات پورے روس میں پھیلے ہوئے تھے، جہاں وہ ہزاروں ملازموں اور خادماؤں کے ساتھ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی اپنی خصوصی ٹرینیں تھیں، سینما تھے اور تفریح کے لئے مخصوص مقامات۔

اس کے مقابلہ میں غیر مراعات یافتہ اور محروم لوگوں کا طبقہ تھا، یہ روایتی طور پر بالکل روسی تھے، مغربی تہذیب و تمدن سے نفرت کرتے تھے۔ پیٹر دی گریٹ کے زمانہ میں، جس نے روس میں مغربی تہذیب کو فروغ دیا، یہ فروغ عوام کے مفادات کے خلاف ہوا، اور اس میں ان سے قربانی دی گئی، اس لئے ان میں مغربی تہذیب کے خلاف مخالفانہ جذبات اور یہ جذبات ان طبقوں کے خلاف بھی تھے جنہوں نے اپنے معاشرہ کی روایات سے علیحدہ کر کے خود کو مغربی بنا لیا تھا۔

اس طرح سے ان دو دنیاؤں میں بڑا فرق تھا۔ مراعات یافتہ طبقہ خوشبوؤں اور گیتوں کی دنیا میں رہتا تھا، جبکہ غیر مراعات یافتہ لوگ گندگی و غلاظت میں گھرے چھوٹے اور تنگ مکانوں میں زندگی گزارتے تھے۔ حکومت کی آمدنی بادشاہ و امراء کی عیاشیوں پر خرچ ہوتی تھی جب کہ ملک کی حالت انتہائی خراب تھی۔ سڑکیں و شاہراہیں ٹوٹی پھوٹی تھیں، تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ پولیس و انتظامیہ بدعنوان تھی، رشوت کا عام رواج تھا اور کسی بھی جگہ وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

1914ء میں جب جنگ کی ابتداء ہوئی تو اس نے روس میں معاشرتی جمود کو توڑا۔ لوگ گاؤں سے شہروں میں آئے تو انہوں نے دونوں طبقوں کی زندگی کا موازنہ کرنا شروع کیا اور ان میں یہ جذبات پیدا ہونا شروع ہوئے کہ جس زمین پر وہ کام کرتے ہیں، جن فصلوں کو وہ اگاتے

ہیں، اس کی پیداوار پر ان کا حق ہونا چاہئے۔ ریاست، چرچ اور جاگیردار جو بغیر کام کئے ان سے فصلیں چھین لیتے ہیں، اور انہیں ان کی محنت سے محروم کر دیتے ہیں، ان سے یہ حق چھینا چاہئے اور جو خود کام نہیں کرتے انہیں کھانے کو بھی نہیں ملنا چاہئے۔

کسانوں کی تبدیلی کی اس خواہش میں تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کا ساتھ دیا۔ چونکہ تحریر و تقریر پر پابندیاں تھیں، سیاسی آزادی کا فقدان تھا، اس لئے ان پابندیوں کی وجہ سے روس میں خفیہ انقلابی جماعتوں کی ابتداء ہوئی جنہوں نے خفیہ مقالوں، کتابوں، اور اشتہارات کے ذریعہ لوگوں میں انقلابی خیالات کو پھیلانا شروع کیا۔ یہ انقلابی جماعتیں ایسے لوگوں پر مشتمل تھیں جن میں خلوص، لگن اور جذبہ تھا۔ اس کا اظہار اس خطاب سے ہوتا ہے جو 1878ء میں ایک جماعت کے انقلابی اراکین سے کیا گیا تھا۔

"وعدہ کرو کہ تم اپنی تمام روحانی و مادی قوتوں کو انقلاب کے لئے وقف کر دو گے، اور اس کی خاطر اپنے خاندان، ذاتی تعلقات، محبت اور دوستی کو قربان کر دو گے، اور اگر ضرورت پڑے تو بغیر جھجک کے اپنی جان بھی دے دو گے اس لئے تمہیں چاہئے کہ کوئی نجی جائداد نہ رکھو، اور اپنی جماعت کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنا مت سمجھو، اپنی جان، خواہش، اور ہر چیز کو جماعت کے لئے وقف کر دو۔"

حکومت نے ان انقلابی سرگرمیوں کا سختی سے محاسبہ کیا اور انقلابیوں کو کچلنے کی خاطر انہیں جیلوں میں ڈال دیا گیا، سائبیریا میں جلاوطن کیا گیا اور سزائے موت کے ذریعہ ان کی سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ کا یہ اصول رہا ہے کہ جس قدر تشدد کے ذریعہ ایک چیز کو دبایا جاتا ہے اسی قدر مزاحمت کا جذبہ شدید اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے تشدد کے ساتھ ساتھ روس میں بھی مزاحمتی تحریکیں بڑھتی گئیں اور انقلابیوں نے جب نظام کو تبدیل کرنے کی کوئی راہ نہیں دیکھی تو انہوں نے دہشت گردی اور تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اس میں نہ صرف زار پر حملے کئے گئے، (ایک حملہ میں 1881ء میں الیگزینڈر دوم مارا گیا) بلکہ فوج کے بڑے عہدے دار، دربار شاہی کے افسران، اور امراء کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نوجوان انقلابیوں کے جذبہ کا اظہار اس ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب ایک شہزادے کے قتل کے مجرم سے کہا گیا کہ اگر وہ زار سے معافی مانگ لے تو اسے رہا کر دیا جائے گا۔ اس پر اس نے کہا کہ "نہیں، کیونکہ میری موت دوسرے انقلابیوں کو حوصلہ دے گی۔"

حکومت کا خیال تھا کہ سزاؤں کے ذریعہ انقلابیوں کی ہمتوں اور حوصلوں کو پست کیا جائے گا مگر اس نے انقلابیوں کو اور سخت جان بنا دیا۔

دہشت گردی کی یہ کاروائیاں اگرچہ نظام کو تو تبدیل نہیں کر سکیں' مگر انہوں نے مراعات یافتہ طبقوں کا سکون ضرور برباد کر دیا' اور انہیں یہ احساس ضرور ہوا کہ ان کی مراعات محفوظ نہیں ہیں اور ان کے تحفظ کی ضرورت ہے۔

جب حکمراں طبقوں کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ نچلے طبقوں میں ان کے خلاف بے چینی پیدا ہو رہی ہے اور ان کی مراعات کے خلاف لوگوں میں غم و غصہ کے جذبات ابھر رہے ہیں تو اس وقت وہ قدیم نظام کو بچانے کے لئے اصلاحات کا سہارا لیتے ہیں' تاکہ اس ذریعہ سے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ وہ اس کا تحفظ کر سکیں۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے' اس وقت محض اصلاحات کے ذریعہ معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کو نہیں روکا جا سکتا ہے' کیونکہ یہ اصلاحات ہمیشہ اوپر سے آتی ہیں' اور حکمراں طبقے ان اصلاحات کو شروع کرتے ہیں' اس لئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اصلاحات ایک محدود دائرے میں رہیں اور ان کے ذریعہ ان کی مراعات ختم نہ ہوں۔ اس لئے نظام میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر یہ اصلاحات معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔

روسی معاشرے کے مسائل کا حل بھی اصلاحات کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کام سرگی وٹ نے کیا جو روس کا 1892ء سے 1903ء تک وزیر مالیات تھا۔ اس نے روس کے معاشی مسائل اور اقتصادی بحران کا یہ حل نکالا کہ روس کو ایک صنعتی ملک بنایا جائے' کیونکہ دوسری صورت میں روس یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں پس ماندہ رہ جائے گا' اور اس طرح اس کی ایشیائی نوآبادیات پر یورپی ممالک قابض ہو کر اس کو وسائل سے محروم کر دیں گے۔ صنعتی ترقی کے لئے اسے سرمایہ کی ضرورت تھی' اس لئے اس نے فرانس اور بیلجیم سے قرضے لئے اور روس میں بھاری صنعتیں قائم کرنا شروع کر دیں' اور کوشش کی کہ روس صنعتی طور پر یورپ کے ہم پلہ ہو جائے لیکن صنعتی ترقی کے باوجود روس میں عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہوا۔ دیہاتی زندگی اسی طرح سے رواں رہی۔ فصلیں تباہ ہوتی رہیں' قحط آتے رہے' کسانوں پر ٹیکس کا بوجھ بڑھتا رہا' اور ان میں قدیم نظام سے نفرت بڑھتی رہی۔

نئی صنعتوں کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اس سے مزدور طبقہ پیدا ہوا۔ یہ مزدور ان کسانوں سے تعلق رکھتے تھے جو گاؤں اور دیہات کی غربت و افلاس سے تنگ آ کر شہروں میں آ کر کم تنخواہوں پر فیکٹریوں میں ملازم ہوتے تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی سخت اور مشکلات سے گھری ہوئی تھی اور بہت کام کرنے کے باوجود انہیں زندہ رہنے کے لئے بہت کم ملتا تھا۔ مگر ان

فیکٹریوں کی زندگی نے انہیں سیاسی شعور دیا' اکٹھے کام کرنے نے ان میں اتحاد و اتفاق کو پیدا کیا اور مطالبوں کے لئے ہڑتالوں نے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا' سختی و تشدد سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد یہ صحیح انقلابی بن کر ابھرے۔

کسان اور مزدور روسی انقلاب کا ہراول دستہ اس لئے بنے کہ یہ ان محروم طبقوں میں سے تھے کہ جن کے پاس کچھ نہیں تھا' اور یہ زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لئے ہر انقلابی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار تھے۔

ان محروم اور مظلوم طبقوں کی حمایت میں روس کا دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ آگے آیا' اور انہوں نے مل کر انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اس نے تحریکوں کو ایک مقصد منصوبہ اور نصب العین کو متعین کرنے میں مدد کی۔

صنعتی اصلاحات نے روس کے جاگیردار معاشرہ کو متاثر کیا' کیونکہ ایک مرتبہ جب ملک میں صنعتی عمل شروع ہوا' تو صنعتی قانونوں کے تحت معاشرے کے روایتی ڈھانچہ کو بدلنے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ جاگیردار طبقہ ان تبدیلیوں سے ناخوش ہوا' اس لئے امراء کی جانب سے وٹ کی اصلاحات کی مخالفت شروع ہو گئی' کیونکہ وہ ان تبدیلیوں سے خوف زدہ تھے جو صنعت اپنے ساتھ لا رہی تھی' جس میں سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے اسکولوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ تعلیم جاگیردار طبقہ کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی' اس لئے وٹ نے زار سے کہا تھا کہ "مجھے معلوم ہے کہ تعلیم لوگوں کو عوام کر دے گی' مگر روسی عوام تہذیب اور روشن خیالی سے دور ترقی و سائنس کے عہد میں ہیں' اس لئے انہیں تبدیل کرنے کے لئے تعلیم لازمی ہے۔"

صنعتی ترقی نے تاجر طبقہ کو آگے بڑھایا' اس لئے جاگیرداروں نے یہ محسوس کیا کہ اس سے ان کی سماجی حیثیت متاثر ہو رہی ہے' کیونکہ یہ تاجر طبقہ کے مفاد میں تھا کہ روسی کسان کو شہر میں مزدور بنا کر لائے' اور اس سے فیکٹری میں کام کرائے۔ یہ عمل جاگیردار کے لئے فائدہ مند نہیں تھا کیونکہ فیکٹری اور شہری زندگی مزدور کو سیاسی طور پر باشعور بنا رہی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ کہ کسی ملک کی صنعتی ترقی صرف یہ نہیں کہ ریلوے لائن بچھا دی جائے اور بھاری صنعتیں لگا دی جائیں' بلکہ اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ معاشرہ کی نفسیاتی اور ذہنی حالت کو بھی بدلا جائے' کیونکہ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کا ذہن صنعتی تبدیلیوں کو قبول کرے۔ صنعتی ترقی اوپر سے مسلط نہیں کی جاتی' بلکہ اس کی نشوونما معاشرہ کے اندر اور اس کی جڑوں میں سے ہوتی ہے۔ محض ملکی ضرورت یا سرمایہ کو باہر سے منگا کر اس

بنیادوں پر ملک کو صنعتی نہیں بنایا جا سکتا ہے' یہ عمل جب تک معاشرہ خود نہ کرے اس میں کامیابی نہیں ہوتی ہے' کیونکہ ایجاد ایک شخص کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے پس منظر میں معاشرہ کی ترقی' اس کی جدّت اور ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے روس کے پس ماندہ اور زراعتی معاشرہ میں صنعتی ترقی جڑ نہیں پکڑ سکی کیونکہ نظام جاگیرداری میں تمام ادارے اور روایات اس کے خلاف تھیں۔ روس کی مطلق العنان بادشاہت اور اس کا زراعتی ڈھانچہ صنعتی بننے پر تیار نہیں تھا' اس لئے 1903ء میں دربار کی مخالفت کی وجہ سے وٹ کو استعفیٰ دینا پڑا۔

فروری 1904ء میں جاپان نے روس کو ایک بحری جنگ میں شکست دیدی' اگرچہ یہ فتح کوئی بڑی اور اہم نہیں تھی مگر اس نے نفسیاتی طور پر روس میں اہم مسائل پیدا کئے۔ ایک وسیع و عریض اور طاقت ور ملک کی چھوٹے سے جاپان کے ہاتھوں شکست نے روس اور اس کے معاشرے کی کمزوریوں کو دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیا (مئی 1905ء میں جاپان نے روس کے بحری بیڑہ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا) روسی عوام نے اس کمزوری کی تمام ذمہ داری حکومت اور حکمران طبقوں پر ڈالی اور احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

1905ء میں ایک مظاہرہ فادر گاپن کی راہنمائی میں مزدوروں نے کیا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ سرما کے محل میں جا کر زار کو اپنے مطالبات پیش کریں۔ فادر گاپن بذات خود پولیس کا آدمی تھا جسے مزدوروں میں تعینات کیا گیا تھا' جب مزدوروں نے مارچ کیا تو پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کر کے کئی سو مردوں' عورتوں' اور بچوں کو مار ڈالا تو اس واقعہ کے بعد سے زار اور عوام کے درمیان جو تعلق تھا وہ ختم ہو گیا' اور زار عوام میں قاتل کے طور پر مشہور ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد اکتوبر میں مزدوروں نے مکمل ہڑتال کی جس نے تمام کاروبار کو بالکل بند کر دیا۔ مزدوروں نے سوویٹ کی تشکیل کی۔ ایک ہزار مزدوروں پر ایک سوویٹ بنائی گئی تاکہ وہ مزدوروں کے مسائل کو حل کرے' اس تحریک میں لیون ٹراٹسکی نے نمایاں حصہ لیا۔

ان مظاہروں نے زار کو اس پر مجبور کیا کہ وہ ملک میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ کرے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک بار پھر وٹ کو بلایا' جس نے اکتوبر مینی فیسٹو کے ذریعہ بنیادی حقوق کا اعلان کیا' سیاسی جماعتوں کے بنانے کی اجازت دی گئی اور امپیریل ڈیوما (اسمبلی) کو بلانے کا اعلان کیا گیا۔ اگرچہ یکے بعد دیگرے چار اسمبلیوں کو بلایا گیا' مگر زار اور مراعات یافتہ طبقے نے سیاسی عمل کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ عوامی مظاہروں کو فوج سختی سے کچلتی رہی۔ جو رعایتیں ابتداء میں دی گئی تھیں انہیں واپس لے لیا گیا' اور جب بھی ضرورت ہوئی ایمرجنسی کے ذریعہ

قوانین کا نفاذ کر دیا گیا۔ بائیں بازو والوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور اکثر کو سائبیریا جلاوطن کر دیا گیا۔

اسی دوران دربار میں ایک مذہبی شخص راسپوتن کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ زار کا ولی عہد لڑکا ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا کہ جس میں اگر چوٹ لگنے سے خون بہنا شروع ہو جائے تو وہ رکتا نہیں ہے۔ یہ ایک موروثی بیماری ہوتی ہے اور اس کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ جب ڈاکٹروں نے علاج سے مایوسی کا اظہار کیا تو الیگزینڈرا نے راسپوتن سے مدد طلب کی جو اپنی روحانی طاقت سے یا ہپناٹزم کی مدد سے خون بہنے کو روک دیتا تھا' اس وجہ سے ملکہ اور دربار کے لوگوں کا راسپوتن پر اعتقاد بڑھ گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے حکومت کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی اور جو بھی اس کی ذرا بھی مخالفت کرتا وہ اسے اس کے عہدے سے برطرف کرا دیتا تھا' اس وجہ سے حکومت کے معاملات میں خرابیاں پیدا ہوئیں۔

1913ء میں رومانوف خاندان کے دور حکومت کے تین سو سال پورے ہوئے' اور پورے ملک میں زبردست جشن منایا گیا تاکہ لوگوں میں اس خاندان کے لئے وفاداری کے جذبات کو ابھارا جائے۔ جشن میں لوگوں نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا' اس سے زار کو یہ احساس ہوا کہ وہ عوام میں بہت مقبول ہے' لہٰذا اس کے رویہ میں تبدیلی آئی اور اس کی مطلق العنانیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

روس کے معاشرہ میں 1905ء کے بعد سے زبردست تبدیلی آئی۔ ناکام انقلاب کے بعد انقلابیوں نے اس کا تجزیہ کیا کہ ان کی کوششیں کیوں ناکام رہیں' اور اس تجزیہ کے بعد انہوں نے انقلاب کے حصول کی خاطر نئے اصولوں پر عمل کر کے جدوجہد شروع کی۔

امپیریل ڈیوما (اسمبلی) اگرچہ کسی دستوری اصلاحات کا تو نفاذ نہیں کر سکی مگر اس نے اپنے پلیٹ فارم سے بحث و مباحثہ کے مواقع ضرور فراہم کئے کہ جس میں روشن خیال امراء' دانشوروں' وکیلوں اور ڈاکٹروں نے مل کر جمہوریت پسند جماعت بنائی' جس میں بادشاہت کو دستوری ادارہ بنانا اور نجی جائیداد کے تقدس کو برقرار رکھنا ان کے مقصد میں تھا۔ ان کے مقابلہ میں دو اور جماعتیں تشکیل ہوئیں سوشل انقلابی' اور سوشل جمہوری۔ ان میں سے سوشل انقلابی جماعت کے اراکین مسلسل قید و بند اور سختیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے جبکہ سوشل جمہوری جماعت مارکس کے نظریات سے متاثر تھی اور جدلیاتی فلسفہ کی روشنی میں انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔

روس میں انقلاب کا عمل ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا کیونکہ صدیوں کے قائم شدہ نظام کو الٹنے میں وقت درکار تھا مگر 1914ء کی جنگ نے ٹوٹ پھوٹ کے اس عمل اور انقلاب کو بہت جلد ممکن بنا دیا۔ روس اس جنگ کے لئے تیار نہیں تھا؛ اس کے اندرونی مسائل اس قدر تھے کہ اس کے لئے جنگ میں شرکت کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ روس جرمنی کے مقابلہ میں صنعتی و سائنسی اور فنی لحاظ سے ایک پس ماندہ ملک تھا۔ اس لئے جب جنگ شروع ہوئی تو روس کی کمزوریاں ایک ایک کر کے سامنے آنے لگیں۔ ہتھیار و اسلحہ، سامان رسد اور لوہے کی کمی، ذرائع حمل و نقل کی تنگی، ریلوے لائنوں کی خرابی، انتظامیہ کی نااہلی، بدعنوانی ان سب باتوں نے مل کر روس کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا۔ اس جنگ میں روس کے کسان فوجیوں کا بری طرح سے قتل عام ہوا۔ گاؤں کے گاؤں مردوں سے خالی ہو گئے؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجیوں میں حکومت اور زار سے نفرت بڑھ گئی۔ جنگ نے ملک کے اندرونی مسائل کو اور شدید کر دیا۔ روٹی اور ایندھن کی سخت کمی ہو گئی، قیمتوں میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ اس کے خلاف 8 مارچ 1917ء کو پیٹروگراڈ میں عوام نے مظاہرے شروع کر دیے جن میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 9 مارچ کو جو مظاہرے ہوئے ان پر فوج نے فائرنگ نہیں کی بلکہ وہ خود عوام کے ساتھ مظاہروں میں شامل ہو گئے۔ 10 مارچ کو مزدوروں نے ہڑتال کی۔ چونکہ فوج کاشتکار تھی؛ اس لئے مظاہرین کے خلاف فوج کی کمی تھی اور اکثر فوجی دستے بغاوت کر کے عوام کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان حالات میں زار کی حکومت ختم ہو گئی اور اسمبلی نے حکومت کے اختیارات سنبھال لئے۔ دوسری طرف مزدوروں اور سپاہیوں کی نمائندگی کے لئے سوویت کا قیام عمل میں آیا؛ اس میں ہر ایک فوجی دستہ کا ایک نمائندہ اور ہزار مزدوروں کا ایک نمائندہ منتخب ہوئے۔ اس طرح اسمبلی اور سوویت نے مل کر حکومت کی تشکیل کی۔

15 اپریل کو نکولس دوم نے تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا؛ اس کے ساتھ ہی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا۔

16 اپریل کو لینن سوئٹزرلینڈ سے دس سال کی جلاوطنی کے بعد روس آیا اور اس نے اپریل تھیسس میں عبوری حکومت، پولیس، فوج اور نوکر شاہی، اور جنگ کے خاتمے کا اعلان کیا۔ لینن کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ اس وقت روسی عوام کی سب سے بڑی خواہش امن ہے، اس لئے اس نے امن کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا۔

عبوری حکومت جس کا سربراہ کرنسکی تھا اس میں اور پیٹروگراڈ کی سوویت میں بنیادی اختلافات پیدا ہو گئے کیونکہ حکومت زار کی پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے جنگ کو ختم نہیں کرنا

چاہتی تھی، جب کہ سوویت روسی حکمراں طبقوں کی اس جنگ کے خلاف تھی، اور عوام کے ساتھ مل کر امن کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔

اس عرصہ میں پورے روس میں جگہ جگہ سوویت کا قیام عمل میں [illegible] تعداد چار سو تھی، اگست میں یہ چھ سو ہو گئیں اور اکتوبر میں [illegible] سوویت کو اور مضبوط کر دیا اور وہ عبوری حکومت سے ٹکر لینے پر تیار ہو گئے۔ [illegible] بورژوا اور مراعات یافتہ طبقوں کی نمائندگی کرتی تھی، جبکہ سوویتس میں [illegible] تھے۔ اس فرق نے عبوری حکومت کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔ جنگ کے [illegible] ناکامی نے عوام کی ہمدردیاں سوویتس کی طرف کر دیں۔ ملک میں انتشار سے [illegible] میں کسانوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ زمینوں پر قبضہ کرنا اور جاگیرداروں کو [illegible] بغاوت کے اہم عناصر تھے۔ ادھر محاذ سے فوجی فرار ہو کر آنے لگے، اور اپنے افسروں کو قتل کر کے بغاوتیں کرنے لگے۔ شہروں میں مزدوروں نے فیکٹریوں پر قبضے کر لئے۔

ان حالات میں قدیم نظام کے حامیوں نے فوجی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی اور کورنی لوف کی سربراہی میں فوج نے پیٹروگراڈ پر قبضہ کا پروگرام بنایا، لیکن اس کی فوج سوویت فوج کے آگے نہیں ٹھہر سکی۔ روس کے فوجی لڑنے کے بجائے عوام سے مل گئے اس طرح رد انقلاب کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

اس موقع پر لینن نے لوگوں کے جذبات اور وقت کی ضرورت کے تحت منصوبہ بنایا [illegible] میں پرولتاری آمریت کا قیام، جنگ بندی تاکہ فوجی مطمئن ہوں، کسانوں میں زمینوں کی تقسیم، چھوٹی قومیتوں کے لئے حق خود ارادیت، اور سماجی انصاف شامل تھے۔

ٹراٹسکی نے ریڈ گارڈز کو مسلح کر کے حکومت پر قبضہ کا منصوبہ تیار کیا۔ نومبر کو بالشویک نے سرمائی محل پر قبضہ کر کے پیٹروگراڈ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور اس طرح انقلاب کامیاب ہو گیا۔ نئی حکومت کا سربراہ لینن ہوا؛ اس نے فوری طور پر دو اہم اعلانات کئے، "جنگ بندی" اور زمین کا کسانوں میں تقسیم کرنا، ان دو اقدامات نے روسی عوام کو نئی حکومت کے ساتھ کر دیا۔

اکتوبر انقلاب کے بعد روس کی نئی حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تشکیل نو کا تھا۔ زار کی حکومت کی بدعنوانیاں، جنگ کی تباہ کاریاں، سیاسی انتشار اور افراتفری، اور انقلاب کے دوران ٹوٹ پھوٹ نے ملک میں لاتعداد مسائل پیدا کر دیے تھے۔

نئی حکومت نے قدیم اداروں کو ختم کر کے 1918ء کے دستور کے تحت مراعات یافتہ طبقوں کا خاتمہ کر کے مساوات کے اصول کو قائم کیا۔ چرچ، خانقاہیں، اور جاگیرداروں کو ختم کر کے ان

کی زمینوں پر قبضہ کیا' مذہب کو نجی معاملہ قرار دیا' عورتوں کو برابر کے حقوق دیے' نسلی تعصبات کے خلاف قوانین بنائے' مفت تعلیم کا بندوبست کیا' لوگوں کو مکانات فراہم کیے' بینکوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا۔ دوسری اصلاحات میں گریگورین کیلنڈر کو رائج کیا اور رسم الخط کو سہل بنانے کا کام کیا۔

انقلاب کو دوسرا بڑا خطرہ ان رجعت پسند روسیوں سے تھا جو سفید روسی کہلاتے تھے اور غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے سرخ فوجوں سے لڑ رہے تھے۔ اندرونی طور پر کئی جماعتیں اور گروہ تھے جو بالشویک حکومت کے خلاف تھے۔ ان حالات میں تشدد کی پالیسی کو اختیار کیا گیا اور ٹراٹسکی کی سربراہی میں سرخ فوج نے متحد اور منظم ہو کے ساتھ جنگیں لڑیں اور مخالفت کو سختی سے ختم کر دیا۔ یہ سلسلہ 1921ء تک جاری رہا اور نئی حکومت خانہ جنگی' معاشی بدحالی اور انتشار کے باوجود قائم رہی اور مسائل کو ایک ایک کر کے حل کیا۔

نئی معاشی پالیسی کے تحت ملک کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور جب ملک معاشی و سیاسی طور پر مستحکم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی تشدد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ تحریر و تقریر کی آزادی ملی اور زندگی کے معمولات دوبارہ سے لوٹ آئے۔

جنگ سے لے کر انقلاب تک روسی عوام نے ان گنت قربانیاں دیں' مشکلات و سختیوں کو برداشت کیا اور انقلاب کے بعد قدیم نظام کے خاتمہ اور نئے نظام نے انہیں جو توانائی اور قوت دی اسے استعمال کر کے نئی حکومت نے روس کو ایک عالمی طاقت بنا دیا۔

چینی انقلاب

فرانسیسی اور روسی انقلابات کے بعد تیسرا اہم انقلاب چین کا ہے۔ یہ ایشیا کے ایک ایسے ملک میں آیا کہ جو زمانہ قدیم میں تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا تھا' مگر وقت کے ساتھ اس کے تہذیبی و تمدنی ادارے فرسودہ ہوتے چلے گئے اور یہ ابھرتے ہوئے یورپ کے مقابلہ میں پسماندہ ہو تا چلا گیا۔ چین جغرافیائی محل وقوع' وسعت زبان' اور ثقافت کے اعتبار سے ایک پر اسرار ملک تھا۔ جب یورپی اقوام سمندر پار نو آبادیات کی تلاش میں نکلیں تو چین اپنی کمزوریوں کے ساتھ ایک ایسا لقمہ تر تھا کہ جس میں اپنا دفاع کرنے کی سکت نہیں تھی' اس لئے برطانیہ' جرمنی' امریکہ اور جاپان نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کا خوب استحصال کیا۔

مغربی اقوام کے استحصال اور ان کے ساتھ تعلقات نے چین کے معاشرہ کے جمود کو توڑا' اور جب مغربی افکار و نظریات کا رواج ہوا تو چین ایک طویل عرصہ بعد اپنی تنہائی سے باہر نکل آیا' اور خصوصیت سے نوجوانوں میں نئے خیالات کے تحت حالات کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ جذبہ قومیت کی شکل میں بیدار ہوا جس کے تحت انقلابی جماعتوں اور گروہوں کی تشکیل ہونا شروع ہوئی۔ ان تحریکوں نے چین کے فرسودہ سیاسی و معاشی اور سماجی اداروں کو تبدیل کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ ان تحریکوں میں غیر ملکیوں کے خلاف بغاوتیں بھی تھیں اور معاشرہ کو سدھارنے کے لئے اصلاحات کے منصوبے بھی۔

چین کا معاشرہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ تھا۔ اس کے حکمران طبقے جاگیردار و امراء' بادشاہ کی سربراہی میں ملک کی زمینوں اور ذرائع پیداوار پر قابض تھے۔ کسانوں کو صرف معمولی اجرت پر ان کی زمینوں پر کام کرنا پڑتا تھا' بلکہ اس کے ساتھ ٹیکسوں کے بوجھ اور بیگار نے ان کی معاشی حالت کو انتہائی ابتر بنا دیا تھا۔

چین کے کسان اس ظلم و استحصال کے خلاف وقتاً" فوقتاً" بغاوتیں کرتے رہتے تھے' لیکن ان کی یہ بغاوتیں اس لئے ہمیشہ ناکام رہیں کہ ان کے پاس سیاسی شعور کی کمی تھی' اور ان کے راہنماؤں میں منصوبہ بندی کی اہلیت نہیں تھی اور نہ ہی یہ بغاوتیں کسی منظم جماعت کی جانب سے برپا کی گئی تھیں۔ مگر تاریخ میں ناکام بغاوتیں بھی اپنے اثرات چھوڑتی ہیں کیونکہ بعد میں

ان کی ناکامیوں کا تجزیہ کر کے چینی انقلابی راہنماؤں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور انقلابی عمل میں ان کے بہت سے جنگی حربوں اور اقدامات کو اختیار کیا۔

چینی انقلاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں چینی معاشرے میں پیوست ہیں۔ انقلاب کا عمل چین کے حالات میں پروان چڑھا اور اسے چین کے حالات کے مطابق ڈھالا گیا۔ اس لحاظ سے چین کی کمیونسٹ پارٹی نے ماؤ کی سربراہی میں جس انقلابی جدوجہد کی ابتداء کی' وہ خالص چین کی سرزمین کی پیداوار تھی۔ ماؤ نے مارکس' اینگلز اور لینن کے خیالات و نظریات سے استفادہ ضرور کیا' لیکن اس نے انہیں چینی بنا دیا اور یہی اس کی کامیابی کی ایک وجہ ہے۔

ماؤ نے بڑی گہرائی کے ساتھ چین کے معاشرے' اس کی اقدار' اور روایات کا مطالعہ کیا' معاشرے کی ساخت اور ڈھانچے کو جانچا اور پرکھا' اور اس بات کی نشاندہی کی کہ چین کے معاشرے کے کون سے طبقے ایسے ہیں جو انقلابی جدوجہد میں ساتھ دیں گے۔ کون سے طبقے مخالفت کریں گے اور کن اصولوں کی بنیاد پر ان طبقوں کو متحد کیا جائے' اور کن منصوبوں کے ساتھ انقلاب دشمن عناصر پر حملہ کیا جائے۔

ماؤ نے چین کے معاشرے کا جو تجزیہ کیا اس کے مطابق معاشرہ کا اہم اور طاقتور طبقہ جاگیرداروں کا تھا جس نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر امپیریل طاقتوں سے اتحاد کر رکھا تھا اور ان کے ساتھ مل کر چین کے مادی ذرائع کا استحصال کر رہا تھا۔ اس طبقہ کے مفاد میں قطعی یہ نہیں تھا کہ معاشرے میں کوئی تبدیلی آئے' کیونکہ تبدیلی کا مطلب ہی مراعات اور طاقت سے دستبردار ہونا تھا۔

جاگیرداروں کے بعد بورژوا طبقہ تھا' یہ بھی امپیریل طاقتوں کا ایجنٹ تھا۔ چونکہ چین میں مختلف بیرونی طاقتوں کا اثر تھا' اس لئے اس طبقہ کے لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ان طاقتوں کے مفادات کے لئے کام کر رہے تھے' اس لئے ان کا کردار اور طریقہ کار بھی بدلتا رہتا تھا۔ جب کوئی ایک طاقت چین کے خلاف ہوتی' تو دوسری طاقتوں کے ایجنٹ اس کے خلاف متحد ہو جاتے' مگر جب اس کی پالیسی بدلتی تو یہ بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لیتے تھے مثلاً ایک وقت میں جب امریکی اور یورپی طاقتیں جاپان کے خلاف ہو گئیں' تو ان کے ایجنٹ بھی جاپان کے خلاف تحریک میں حصہ لینے لگے' مگر ان کی پالیسی بدلی تو یہ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ ان کے اس کردار نے چین کو نقصان پہنچایا' اور امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

انہیں میں قومی بورژوا طبقہ بھی تھا' جو امپیریل طاقتوں کا ایجنٹ تو نہیں تھا کیونکہ ان کی موجودگی میں یہ ترقی نہیں کر سکتا تھا' مگر اپنے رجحانات کی وجہ سے یہ رجعت پسند تھا۔ اس کے مقابلہ میں پیٹی بورژوا جن میں چھوٹے تاجر' دست کار' دو پیشہ ور لوگ تھے یہ معاشرہ کی تبدیلی کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

ماؤ نے اس کا اظہار کیا کہ دانشور اور طالب علم کوئی ایک طبقہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ مختلف طبقوں سے مل کر ایک جماعت بنتے ہیں۔ چین میں تعلیم کے بڑھنے کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا' اس لئے انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ ان میں ہر قسم کے عناصر شامل تھے' اور ان میں کچھ امپیریل طاقتوں کے' کچھ جاگیرداروں کے اور کچھ بورژوا طبقوں کے ایجنٹ تھے' مگر ان دانشوروں اور طالب علموں میں ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد تھی جو بے روزگاری اور عدم تحفظ کا شکار تھے' اس لئے یہ قدیم نظام کے خلاف ہر اس تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار تھے کہ جو حالات کو بدل کر انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ ماؤ اس کا قائل تھا کہ انقلابی دانشوروں کے بغیر انقلابی جدوجہد نہیں ہو سکتی ہے۔

چین کی آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی۔ یہ آبادی کا 80 فیصد تھے۔ یہ بھی کئی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے' مثلاً امیر کسان جو دیہاتی آبادی کا 5 فیصد تھے۔ اگرچہ یہ غریب کسانوں کا استحصال کرتے تھے کیونکہ اپنے کھیتوں میں ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اس لئے ان کا تعلق کسان طبقہ سے ہو جاتا تھا۔ متوسط درجہ کے کسان دیہاتی آبادی میں 20 فیصد تھے چونکہ یہ کسی کا بھی استحصال نہیں کرتے تھے اس لئے انہیں انقلاب میں شریک کر کے ان سے اتحاد کیا جا سکتا تھا۔ غریب کسان دیہاتی آبادی کا 70 فیصد تھے' ان کے پاس نہ تو زمین تھی اور نہ ہی ان کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا گزارا کر سکیں' اس لئے ان میں تبدیلی کی زبردست خواہش موجود تھی' اور اسے زندہ کرنا' ابھارنا' اور کام میں لانا انقلابی قوتوں کا کام تھا۔

کسانوں کے مقابلہ میں چین میں مزدور اور پرولتاری طبقہ بہت کم تھا۔ ان میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور' چھوٹی صنعتوں اور دکانوں پر کام کرنے والے تھے۔ یہ مزدور گاؤں کے وہ کسان تھے جو روزگار کی تلاش میں شہروں میں آئے تھے اس لئے ان کی جڑیں گاؤں اور کسان طبقے میں تھیں۔ اپنی تعداد کی کمی' اور تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود اس طبقہ میں توانائی اور طاقت تھی۔

ماؤ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ طبقہ اکیلا انقلاب کی جنگ نہیں جیت

سکتا' اس لئے حالات کے تحت ضروری تھا کہ ان تمام طبقوں میں اتحاد ہو جو انقلاب چاہتے ہیں۔ ان میں کسان' مزدور' پٹی بورژوا اور قومی بورژوا طبقے تھے جنہیں ایک متحد اور منظم محاذ کے تحت جمع کرنا ضروری تھا۔

ان طبقوں کے علاوہ چین میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی جو دیہاتوں اور شہروں میں بے روزگاری اور بے کاری کی زندگی گزار رہے تھے' اور معاش کی خاطر یہ لوگ چوری' ڈاکہ زنی' جرائم کرتے' بھیک وخیرات مانگتے' دلالی یا طوائفوں کا پیشہ اختیار کر کے گزارا کرتے۔ نچلی اس سماجی حیثیت کی وجہ سے یہ لوگ نہ تو سیاسی شعور رکھتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی اخلاقی اقدار کے حامل تھے۔ اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے یہ رجعت پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر ان کے لئے غنڈہ گردی کرتے اور کبھی حکمراں طبقوں اور اداروں کے خلاف ہو جاتے۔ اس لئے ماؤ نے اس بات پر زور دیا کہ ان لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں' انہیں باشعور بنا کر ان سے انقلاب کے لئے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔

چین کے طبقات کے اس تجزیہ میں ماؤ نے کہیں مذہبی طبقہ کا ذکر نہیں کیا جو جاگیرداروں اور حکمرانوں کے ساتھ مل کر استحصال میں شریک ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چین میں اس قسم کا کوئی مذہبی ادارہ وجود میں نہیں آیا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا۔ اگرچہ کنفیوشس کی تعلیم چین کے طبقاتی معاشرے کو برقرار رکھنے کی سب سے زیادہ فعال تحریک تھی مگر اس نے کوئی علیحدہ سے ایسا مذہبی گروہ پیدا نہیں کیا کہ جو حکمراں طبقوں کے ساتھ ہوتا۔

ماؤ نے انقلابی جدوجہد میں کسانوں' مزدوروں' پٹی بورژوا اور قومی بورژوا طبقوں کو ملایا تاکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکے۔ اس لئے اس نے انقلاب کا جو راستہ متعین کیا وہ قومی اور جمہوری انقلاب تھا جو کہ امپیریل طاقتوں اور جاگیرداروں کے خلاف تھا۔ مگر اس نے اس بات پر زور دیا کہ دونوں انقلابوں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے۔ ماؤ چین کے لئے عوامی جمہوری انقلاب اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ یہاں سرمایہ دارانہ نظام اپنی چوٹی تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کے بجائے وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا' مگر اس انقلاب کی قوت اور مرکز پرولتاری اور کسان تھے۔

ماؤ نے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عوامی جمہوری انقلاب اس لحاظ سے یورپ اور امریکہ سے مختلف ہو گا کہ اس میں بورژوا طبقہ کی آمریت نہیں ہوگی بلکہ انقلابی طبقوں کا اتحاد ہو گا' اور اس کی سربراہی پرولتاری طبقہ کر رہا ہو گا۔ یہ اس لحاظ سے ماضی

انقلاب سے بھی مختلف ہو گا کہ اس کے ذریعہ امپیریلزم اور اس کے ایجنٹوں کا تختہ الٹا جائے گا مگر ان بورژوا طبقوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا جو کہ اس جدوجہد میں ساتھ ہوں گے۔

ماؤ نے مارکسزم اور لینن ازم سے ہٹ کر چین کے مخصوص حالات میں اس بات کا فیصلہ کیا کہ چین میں انقلاب کے ہراول دستہ کا کام کسان کریں گے مزدور نہیں' کیونکہ چین کی صورتحال یورپ سے مختلف تھی۔ یہ ایک نیم نوآبادیاتی' نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ملک تھا' اس کے شہروں پر امپیریل طاقتوں اور حکمران طبقوں کا تسلط تھا' جہاں فوج' پولیس اور مخبری و جاسوسی کے ادارے بڑی سرگرمی سے انقلابیوں کو کچلنے میں مصروف تھے۔ قید و بند اور موت کی سزاؤں کی وجہ سے انقلابی جدوجہد تسلسل کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی تھی اور انقلابی تحریکوں پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

ان حالات میں ماؤ نے چین کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتائج اخذ کئے کہ چین کی ترقی غیر مساوی ہے' ملک وسیع اور پھیلا ہوا ہے' اس میں کچھ علاقے خوش حال ہیں اور کچھ پسماندہ۔ اس لئے ایسے علاقے جہاں رسل و رسائل کم ہوں' سواری کی دقتیں ہوں' دشوار گزار راستے ہوں غذا کی کمیابی ہو' ایسے علاقوں میں انقلابی ٹھکانوں کی بنیاد رکھی جائے کیونکہ ان پر حکومت نظر نہیں رکھ سکے گی۔ دور دیہاتوں میں پارٹی کو کسانوں میں کام کرنے کا آزادی سے موقع ملے گا' کیونکہ کسانوں کی کثیر تعداد فاقہ زدہ اور زندگی کی سہولتوں سے محروم ہے اس لئے یہ انقلاب میں شریک ہو کر سب سے زیادہ جدوجہد کرے گی۔

اس منصوبہ پر عمل کرتے ہوئے ماؤ نے سب سے پہلے چنگ کانگ شان میں گوریلا ٹھکانہ بنایا' جس میں کسان' پرولتاری' پٹی بورژوا اور چھوٹے زمیندار شامل تھے۔ ان ٹھکانوں کی صورت میں چین میں انقلابی جدوجہد شروع ہوئی۔ ان ٹھکانوں کی تعداد بڑھنے کی اس لئے امید تھی کیونکہ چین کے بڑے بڑے جاگیردار خانہ جنگیوں میں مصروف تھے جس کے نتیجہ میں ان کی طاقت کمزور ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ چین کے وہ علاقے جو 1926ء اور 1927ء کے انقلاب سے متاثر ہوئے تھے وہاں فوجی تسلط کمزور ہو گیا تھا۔

چونکہ انقلابی ٹھکانہ کی بنیاد زمین پر تھی' اس لئے ماؤ نے امیر کسانوں اور چھوٹے زمینداروں پر سختی نہیں کی' ابتداء میں اس نے زمینوں کو ضبط کیا' مگر بعد میں اس پالیسی کو بدلا اور صرف مقامی حکومت اور بڑے زمینداروں کی زمینوں پر قبضہ کیا' اس لئے یہ زمینیں کسان خاندان کے سائز کے مطابق ان میں تقسیم کیں۔

ماؤ نے اس بات پر زور دیا کہ پارٹی اور عوام فوجی خدمت کے لئے تیار رہیں تاکہ ان کا

ٹھکانہ اور فوج دونوں محفوظ رہیں۔ ٹھکانہ میں فوجی تربیت لازمی تھی۔ افسر اور عام فوجی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کو برابر کی تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا تھا اور انہیں نظریاتی تعلیم دے کر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

ماؤ نے ان ٹھکانوں میں جو تربیت دی اس کا اصول یہ تھا کہ جب حکمران طبقے آپس میں لڑائی میں مصروف ہوں تو سرخ فوج بڑے علاقوں میں جنگ کرے' لیکن جب ان میں امن ہو تو فوج آہستہ آہستہ پیش قدمی کرے اور اپنے ٹھکانوں کو مضبوط رکھنے پر توجہ دے۔

ماؤ کی گوریلا جنگ کا اصول یہ تھا کہ فوجیوں کو عوام میں پھیل جانا چاہئے اور انہیں دشمن کے خلاف ابھارنا چاہئے۔ اگر دشمن آگے بڑھے تو پیچھے ہٹنا چاہئے' اگر دشمن رک جائے تو اسے پریشان کرنا چاہئے' اگر دشمن تھک جائے تو اس پر حملہ کرنا چاہئے' اگر دشمن واپس ہو تو اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔

ماؤ کے سامنے یہ ایک حقیقت تھی کہ انقلاب لانے اور اس کے بعد حکومت اور اس کے اداروں کو چلانے کے لئے تربیت یافتہ' ایماندار اور مخلص لوگوں کی ضرورت ہو گی اور یہ کام صرف پارٹی ہی کر سکتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو تیار کرے۔

چین کے انقلاب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم نظام کے ختم ہونے سے پہلے ایک متوازی نظام اور حکومت قائم کر لی گئی تھی' جس نے بعد میں آہستہ آہستہ قدیم نظام اور حکومت کو ختم کیا۔

چین کے انقلاب میں لانگ مارچ ایک اہم تاریخی واقعہ تھا' اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں ماؤ کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کے بعد نئے علاقوں میں انقلابی حکومت قائم ہوئی جس کا مرکز یانان تھا' یہ انقلابی حکومت کا ماڈل بن کر ابھرا۔

یانان میں جو انقلابی حکومت قائم ہوئی اس میں فوجی اور شہری انتظامیہ ایک دوسرے سے تعاون کرتی تھیں۔ عمومی پالیسی پر فیصلے یانان میں ہوتے تھے مگر ہر علاقہ اپنے معاملات میں خود مختار تھا۔ مرکز کے اختیارات کمزور تھے اور مقامی پارٹی ہر علاقے میں وسیع اختیارات رکھتی تھی۔ فیصلے پارٹی میں بحث و مباحثہ اور تنقید کے بعد بدلتے رہتے تھے۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ جن علاقوں میں کام کرتے ہیں وہاں لوگوں سے رابطہ رکھیں اور اپنے فیصلے سختی کے ساتھ ان پر ٹھونسنے کے بجائے ان کو ذہنی طور پر انہیں اختیار کرنے پر آمادہ کریں۔ پارٹی کی ہدایات تھیں کہ کسانوں کے مفادات کے خلاف کوئی کام نہ کریں اور چین کی صدیوں پرانی روایات میں خوشامد اور دربار داری اہم تھیں' ان سے پرہیز کریں۔ لوگوں میں گھل مل کر رہیں' ان سے

برابری کا سلوک کریں۔

نئے علاقوں میں جہاں پارٹی کا تسلط تھا وہاں کو آپریٹو تحریک کے ذریعہ معاشی طور پر خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کی گئی' زراعت و ہلکی صنعتوں کو ترقی دی گئی۔

اس کے ساتھ تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کیونکہ جہاں تعلیم کا اوسط 1930ء کی دہائی میں ایک فیصد تھا وہاں تعلیم کو عام کرنا انتہائی ضروری تھا۔ لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ نصاب کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ جو عملی زندگی میں کام آئے اور تعلیمی اصلاحات کا نفاذ اس طرح سے ہو کہ اس سے کسانوں کو فائدہ پہنچے' اس لئے اسکولوں میں تعلیم کو اس انداز سے دیا گیا کہ اس سے کسانوں کو عملی طور پر تربیت ملی۔

1940ء کی دہائی میں یانان کا دور ایک انقلابی دور تھا اور زیادہ تر تخلیقی کام اسی زمانہ میں ہوئے۔ پارٹی نے اس بات کی کوشش کی کہ غیر ملکی ماڈل کی تقلید سے خود کو بچایا جائے۔

مگر 1949ء میں انقلاب مکمل ہونے کے بعد چین میں سوویت ماڈل کو اپنایا گیا۔ جو زرعی اصلاحات 1946ء میں شروع ہوئی تھیں وہ 1953ء تک جاری رہیں۔ اس سال منصوبہ بندی اور معاشیات میں سوویت ماڈل کی تقلید کی گئی۔ معاشی شعبہ میں سوویت ماڈل اس بات پر زور دیتا ہے کہ بھاری صنعتوں کو فروغ دیا جائے اور ملک کو تیزی سے صنعتی بنایا جائے 1962ء میں ماؤ نے صنعتی ترقی کی رفتار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس دور نے چین کے عوام کی تخلیقی صلاحیتوں کو متاثر کیا ہے مگر یہ دور چین کے لئے لازمی تھا۔ جب منصوبہ بندی کو مرکزیت حاصل ہوئی تو اس کے نتیجہ میں نوکر شاہی طاقتور بن کر ابھری جو پارٹی کی قیادت' منیجروں' انجینئروں اور پیشہ ور لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس سے کسانوں کی بالا دستی کو زک پہنچی اور مساوات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مسلح افواج نے خانہ جنگی میں بغیر کسی عہدے کے جنگ لڑی تھی اور کوریا کی جنگ تک چین کی فوج میں عہدے اور مراعات کا سلسلہ نہیں تھا۔ مگر 1955ء میں سوویت نظام کے تحت فوج میں عہدوں اور مراعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دور میں شہروں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور دیہاتوں کی ترقی روک دی گئی۔ زرعی اصلاحات کو روک کر صنعتی و تجارتی شعبوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔

1958-9ء میں بھاری و ہلکی صنعتوں اور زراعت میں ایک ساتھ ترقی پر زور دیا گیا' جس کے نتیجہ میں جو ترقی ہوئی وہ ناقابل یقین ہے۔ اسی دور میں زراعت میں کمیون کا طریقہ شروع ہوا۔

ماؤ نے چین کے انقلاب کو جن مراحل میں تقسیم کیا وہ اس طرح سے تھے۔

1- بورژوا جمہوری انقلاب جو 1949ء میں اس وقت ختم ہوا جب کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ انقلاب 1950ء کی دہائی تک جاری رہا۔

2- چین کی سماجی تبدیلی جو 1950ء کی دہائی میں مکمل ہوئی۔

3- تیسرا مرحلہ 1950ء کی درمیانی دہائی سے شروع ہوا اس میں کوآپریٹو ملکیت اور عوامی ملکیت کے درمیان ہم آہنگی ہوئی۔

4- اور آنے والے چوتھے دور میں تمام ملکیت عوام کی ہو جائے گی اور پانچویں دور میں کمیونزم کا نفاذ ہو جائے گا۔

5- اس کے بعد بھی مختلف مرحلے ہوں گے جن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ماؤ کے بعد چین کی نئی قیادت نے انقلاب کا رخ موڑ دیا ہے' سرمایہ وارانہ روایات کو آہستہ آہستہ قبول کیا جا رہا ہے جس نے انقلابی عمل کو روک دیا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو چین کو ایک دوسری سمت لے جا رہا ہے۔

تیسری دنیا اور تبدیلی

نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد تیسری دنیا کے ملکوں میں جمہوری عمل جاری نہ رہ سکا۔ ان ملکوں میں اقتدار ان طبقوں کو ملا کہ جن کی جڑیں عوام میں نہ تھیں اور جن کے طبقاتی مفادات عوام سے جدا تھے۔ اس لئے اقتدار کو حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نوآبادیاتی نظام اور اس کے اداروں کو باقی رکھ کے ان کے ذریعہ عوام کا استحصال جاری رکھا۔ یہ ان کے مفاد میں نہیں تھا کہ عوام کو اقتدار میں شریک کیا جائے' اور نہ ان کو متحرک کرکے اس قابل بنایا جائے کہ وہ ان پر انحصار کرنے لگیں۔ اس لئے نوآبادیاتی دور کے دو مضبوط اداروں فوج اور نوکر شاہی نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے اتحاد کر کے سیاسی طاقت و مراعات کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔

تیسری دنیا کے ملکوں میں سیاسی تبدیلی اسی طرح آئی ہے کہ جیسے عہد وسطیٰ میں شاہی خاندانوں کے تبدیل ہونے سے آتی تھی کہ جس میں اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو جاتا تھا اور معاشرہ کا بنیادی ڈھانچہ اسی طرح سے برقرار رہتا تھا۔ اس میں جو بھی تبدیلی آتی تھی وہ معاشرہ کی ساخت کے اندر رہتے ہوئے آتی تھی' اس سے باہر نہیں' آج کل یہ سیاسی تبدیلی تیسری دنیا کے ملکوں میں "کوریج" کے ذریعہ آتی ہے۔ یہ "کو" فوجی و سیاسی قوتوں کے اتحاد کے ذریعہ بھی آتا ہے اور صرف فوج بھی اس کو لے کر آتی ہے۔ اس میں عوام کی حمایت یا ان کی شرکت بالکل نہیں ہوتی' کیونکہ یہ خفیہ سازش اور منصوبہ کے تحت آتا ہے۔ کو' کو لانے میں خود حکومت کی طاقت پس منظر میں کام کرتی ہے کیونکہ یہ ہمیشہ حکومتی اداروں کی مدد سے آتا ہے' اس لئے اس میں عوامی طاقت کو شریک نہیں کیا جاتا' اور نہ کو' کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

کو' صرف سیاسی و معاشی طور پر پس ماندہ ملکوں میں کامیابی کے ساتھ آ سکتا ہے کیونکہ انہیں ملکوں میں حکومت و اقتدار کے ادارے محدود ہوتے ہیں' طاقت اشخاص یا اداروں کے پاس ہوتی ہے' اور جب ان پر قبضہ پا لیا جائے تو کو' کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے کو کا ایک خاص منصوبہ ہوتا ہے وہ اچانک اور بے خبری کے عالم میں فوج' پولیس' ریڈیو' ٹی وی' ٹیلی فون'

ٹیلی گراف اور ذرائع ابلاغ کے حکومتی ذرائع پر قبضہ کرکے' دارالحکومت کی اہم عمارتوں پر قابض ہو جاتے ہیں' جن میں ایوان صدر' وزیراعظم کی رہائش گاہ' اسمبلی کی عمارت و سکریٹریٹ شامل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد دارالحکومت میں شہر کی ناکہ بندی کرکے اہم شاہراہوں پر فوج مقرر کردی جاتی ہے۔ دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں' ٹریڈ یونینوں و طالب علموں کی یونینوں پر پابندی عائد کرکے' سرکردہ سیاسی شخصیتوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ پریس پر سنسرشپ کا نفاذ ہو جاتا ہے' اور جلسہ و جلوس پر مکمل پابندی لگا دی جاتی ہے۔

لیکن سیاسی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں کو کا لانا اور اسے کامیاب بنانا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں اقتدار چند اداروں میں محدود نہیں ہوتا ہے اور اس کے مرکز چند ادارے نہیں ہوتے ہیں' بلکہ سیاسی عمل میں سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں۔ جن کے منظم و تربیت یافتہ کارکن' دفاتر اور نشر و اشاعت کے ادارے ہوتے ہیں۔ ٹریڈ یونین اور ان کے باشعور اراکین ہوتے ہیں۔ عدلیہ اور دیگر قانونی و سیاسی ادارے ہوتے ہیں۔ پریس کی خودمختاری ہوتی ہے۔ اس لئے کو اور اس کے راہنماؤں کے لئے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ ان سب اداروں' جماعتوں' اور گروہوں کو ختم کرسکیں یا ان کا تعاون حاصل کرسکیں۔

اس لئے کو تیسری دنیا کا مقدر ہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی مستحکم نظام نہیں ہوتا۔ یہاں آئے دن دستور بدلتے رہتے ہیں' قوانین میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ شخصی حکومتیں اقتدار کو اپنی ذات یا خاندان میں سمیٹے رکھتی ہیں۔ جمہوری روایات کا فقدان ہوتا ہے۔ ملک میں معاشی بحران ہوتا ہے کہ جس میں بے روزگاری' افراط زر' قیمتوں کی زیادتی' اور غذا کی کمیابی عام باتیں ہوتی ہیں۔ بیماری' جہالت' غربت و افلاس' رہائش کی کمی' قحط سالی اور آبادی میں اضافہ وہ مسائل ہیں کہ جو عوام کو پسماندہ بنا دیتے ہیں۔ ان ملکوں میں حکومت ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے انہیں بہت نصیحتیں کرتی ہے' اخلاقیات کی تعلیم دیتی ہے' فرائض سے آگاہ کرتی ہے' اور انہیں مزید قربانیوں کے لئے تیار رہنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان ملکوں میں روزمرہ کے معمولات میں عام انسان دن رات حکومتی اداروں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ہر روز انسانی عظمت و وقار کو کچلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسانوں کو حیوان بنا دیا جاتا ہے کہ انہیں جس طرح سے چاہیں زندگی گزارنے پر مجبور کردیں۔ دفتروں میں افسروں و عہدے داروں کی ڈانٹ ڈپٹ' رشوت و بدعنوانی سے انہیں روز سابقہ پڑتا ہے۔ روز وہ ٹوٹی و شکستہ سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ابلتے ہوئے گٹر اور گندگی و غلاظت سے دوچار ہوتے ہیں' بیماری کی صورت میں گندے اسپتالوں' غیر ہمدرد ڈاکٹروں' اور ملاوٹ کی دواؤں سے

علاج کراتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کی مشکلات' چوری و ڈاکے' اور حادثات انہیں ہمیشہ عدم تحفظ کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ تیسری دنیا کا عام آدمی ان تمام مسائل کے بوجھ سے دبا ہوتا ہے' اس لئے اس میں تبدیلی کی خواہش تو ہوتی ہے' مگر اس کے اندر جو ماحول کی بے حسی اور بے عملی ہے وہ اسے اس امید پر زندہ رکھتی ہے کہ کوئی مسیحا آئے گا اور ان برائیوں کا خاتمہ کردے گا۔

اور کو کے راہنما اکثر مسیحا کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں۔ وہ عوام کے ان احساسات کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور آتے ہی اس قسم کے اعلانات کرتے ہیں کہ جن میں روزگار' رہائش' صحت و تعلیم کے وعدے ہوتے ہیں۔ بدعنوان و خراب دور کے خاتمہ کی خوش خبری ہوتی ہے اور امیدوں سے بھرے نئے دور کے آنے کی خبر۔

اس لئے کو کے ابتدائی مرحلہ میں معاشرہ کی تطہیر اور صفائی کا زور و شور ہوتا ہے۔ بدعنوان افسروں کو نکالا جاتا ہے۔ نچلے درجہ کے سرکاری اہل کاروں' اور کلرکوں کو جیل بھیجا جاتا ہے۔ سڑکوں کی صفائی ہوتی ہے' دکانوں پر جالیاں لگتی ہیں' اشیاء کی قیمتوں کی فہرستیں آویزاں کی جاتی ہیں' دفتروں میں وقت کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے' انصاف کے لئے جگہ جگہ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں' ناجائز تجاوزات کو ہٹایا جاتا ہے' پریس' ریڈیو' اور ٹی وی پر معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے کی تشہیر کی جاتی ہے' لوگوں میں امیدیں پیدا ہوتی ہیں کہ اب ان کی زندگی میں سکون آنے والا ہے' ان کے مسائل حل ہونے والے ہیں' ظالموں کو ان کے مظالم کی سزا ملنے والی ہے اور معاشرہ میں انصاف قائم ہونے والا ہے۔ مگر یہ سارا ڈرامہ چند مہینوں میں اپنے اختتام پر پہنچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ زندگی اسی ڈگر پر لوٹ آتی ہے' پھر وہی مایوسی' ناامیدی' اور پھر کسی نئے مسیحا کی تلاش۔

تیسری دنیا کے ان ملکوں میں چونکہ سیاسی جماعتوں پر جاگیردار اور سرمایہ دار قابض ہوتے ہیں' اس لئے وہ سیاسی عمل کو عوام تک لے جانے سے بچتے ہیں۔ وہ صرف سیاسی جلسوں' جلوسوں اور اخباری بیانات کے ذریعہ اپنی لیڈرشپ کو زندہ رکھتے ہیں۔ عوام کو سیاسی طور پر باشعور بنانا' ان کی تربیت کرنا' اور ان کی توانائی و قوت کو معاشرے کی تبدیلی کے لئے استعمال کرنا خود ان کے مفاد میں نہیں ہوتا ہے' اس لئے وہ صرف سیاسی و معاشی بحرانوں کے ذریعہ اقتدار میں آنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو کے ساتھ تعاون کرکے اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں اور حکومت کے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر بینک کے قرضوں' امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنسوں اور پلاٹوں کو حاصل کرکے اپنی دولت میں اضافہ کرنا شروع کردیتے ہیں۔

ان ملکوں میں یہی حال مذہبی جماعتوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ عوام کی اکثریت ان کے ساتھ نہیں ہوتی ہے اس لئے یہ انتخابات اور نمائندہ اداروں پر یقین نہیں کرتے' اور کو کے موقع پر

اس کے راہنماؤں کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ اس ذریعہ سے وہ اپنے مذہبی نظریات کا نفاذ کر سکیں۔

کو لانے والے ٹریڈ یونین کے راہنماؤں' طالب علم لیڈروں' دانشوروں' ادیبوں و شاعروں اور علماء و مشائخ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں مراعات دیتے ہیں' جس کے نتیجہ میں ان کے خلاف آواز اٹھانے والے بہت کم رہ جاتے ہیں' اور جو رہ جاتے ہیں ان کو جیل' قید و بند' اذیت و تشدد اور جلاوطنی کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس پورے عمل میں وہ تمام طبقات جو انقلابی تبدیلی چاہتے ہیں' وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں امپیریل طاقتیں معہ بین الاقوامی اجارہ دار کمپنیوں کے موجود ہوتی ہیں۔ یہ حکومتی اداروں کو مالی امداد دے کر اپنے لوٹ کھسوٹ کے دائرہ کو پھیلا دیتی ہیں۔ اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آئے اور حالات جیسے کہ ہیں اسی طرح سے برقرار رہیں۔ اس لئے ان ملکوں میں جو بھی کو آتے ہیں ان کو کسی نہ کسی شکل میں بین الاقوامی کمپنیوں' اور امپیریل طاقتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے تاکہ ان کے مفادات برقرار رہیں' اور ان کے ساتھ معاہدہ باقی رہیں۔ اس طرح غیر ملکی اور ملکی مفادات دونوں آپس میں مل جاتے ہیں' اور تبدیلی کے تمام راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں میں اگر جمہوری عمل شروع بھی ہوتا ہے تو اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ کیونکہ ان ملکوں میں جاگیردار' قبائلی سردار' اور ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ بے پناہ اثرات رکھتا ہے۔ ان کے مخصوص اور محفوظ حلقہ انتخابات ہوتے ہیں کہ جہاں سے ان کے لئے انتخابات جیتنا مشکل نہیں ہوتا' اور جب یہ لوگ نمائندہ اداروں میں جاتے ہیں تو وہاں یہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اپنے علاقوں میں پولیس اور حکومتی اداروں کی مدد سے یہ عوام کا استحصال کرتے ہیں اور خود کو قانون سے بالاتر سمجھ کر ہر قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس میں ٹریفک کی قانون شکنی سے لے کر اپنے مخالفوں کو سزائیں دینا اور قتل کروانا تک شامل ہوتا ہے۔

اس نام نہاد جمہوری حکومت میں بھی عوام کو پہلے کی طرح سے دبایا کچلا جاتا ہے اور وہ اسی طرح زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ ملک کی آمدنی دارالحکومت کو سجانے سنوارنے' اسمبلی کی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرانے' اور نمائندہ اداروں کی تزئین و آرائش پر خرچ کر دی جاتی ہے۔ نوکر شاہی کی مراعات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فوج کی تنخواہیں بڑھ جاتی ہیں' اور عوام کے نمائندہ وی۔ آئی۔ پی بن کر حکومت کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ ایک مایوس کن صورت حال ہے۔ لیکن تیسری دنیا کے عوام کو زندہ رہنا ہے اور اس کی خاطر انہیں راستہ ابھی تلاش کرنا ہے۔